ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

عِصمت چغتائی

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

ایڈیشن ------ ۱۹۸۲ء
تعداد --------- ۱۰۰۰
قیمت -------- ۲۰/۰۰

کتابت : س۔ ریاض، الہ آباد
مطبع : تاج آفسٹ پریس، الہ آباد

ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
ٹیلیفون نمبر ۳۷۶۸

فہرست

پیش لفظ

میں جب عصمت چغتائی کے افسانوں کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہوں تو ایک عجیب دشواری پیش آتی ہے۔ ان کے افسانے عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک اور ہی نہج اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی حیثیت اس قدر مختلف اور منفرد نظر آتی ہے کہ ان پر عام ادبی اقدام کا اطلاق کرتے ہوئے کچھ دقت سی محسوس ہوتی ہے۔ عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پرپیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ میں شاعری نہیں کر رہا اور اگر اس بات میں کوئی شاعری ہے تو اسی حد تک جہاں تک شاعری کو سچی بات میں دخل ہوتا ہے۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے تشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے، اس کی روح میں ہے، اس کے دل میں ہے، اس کے ظاہر میں ہے، اس کے باطن میں ہے۔ یہ افسانے شاید "تل" کی ہیروئن "رانی" کے جسم کی طرح ہیں۔ اور جب کبھی اس ادبی جوہر کو پرکھنے سے عام ادبی اقدار میں ڈھالنے اور کلیوں میں پھانسنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ جوہر ایک نظر نہ آنے والے غیر مرئی ہیولیٰ کی طرح قابو میں نہیں آتا۔ اور "تل" کے ہیرو "چودھری" کے الفاظ میں:

"سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ ہزاروں رنگ لتھیڑنے پر بھی اس کے رنگ جیسا مسالہ تیار نہ کر سکا۔ اس نے سیاہی صندلی گھول کر اس

میں ذرا سا نیلا رنگ ملا دیا پھر بھی اس کے رنگ کی چمک آبنوسی، صندلی، نیلی اور کچھ بادامی لہر لئے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر تھی۔ آج اس کا رنگ سُرمئی ہوتا تو دوسرے دن اس میں شفق کی سی سُرخی پھوٹنے لگتی اور پھر کبھی بالکل اچانک اس کا جسم ختم ہوتی ہوئی رات کی طرح کچھ اودی اودی گھٹاؤں سے ملنے لگتا اور کبھی نہ جانے کہاں سے اس میں سانپ کے زہر کی سی پیلاہٹ جھلکنے لگتی .... اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں۔ اس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے کولتاری سا سیاہ رنگ گھول کر تیار کیا۔ لیکن پھر اسے پُتلی کے گرد لال لال ڈورے نظر آئے۔ خیر وہ بھی ہوئی۔ پھر ان ڈوروں کے آس پاس کی زمین بادلوں کی طرح نیلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جھنجھلا گیا اور ڈھیر سارنگ بیکار کیا۔ لیکن اس کے غصّے کی جب تو انتہا ہی نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں وہ سیاہ کولتار جیسی پتلیاں سبز ہونے لگیں اور ہوتے ہوتے وہ زمرد کی ڈلیوں کی طرح ناچنے لگیں۔ پُتلیوں کے آس پاس کا میداں دودھیلا سفید ہو گیا اور ڈورے قرمزی ہو گئے۔"

یہی گوناگوں بوقلموں رنگا رنگی، ان کی متلون مزاجی، پُرپیچ تواتر اور سحر انگیز مشاطگی جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن شاید اتنی شدت سے بیان نہیں کیا جا سکتا، ان افسانوں کا جوہرِ عظیم ہے۔

پہلے پہل جب میں نے عصمت چغتائی کے افسانے پڑھے تو مجھے یوں معلوم ہوا گویا میرے ذہن کی چار دیواری میں ایک نیا دریچہ کھل گیا ہے۔ یہ دریچہ جو میرے ذہن، شعور اور ادراک کی دنیا میں ایک نئے منظر میں اضافہ کرتا ہے۔ میں نے اس منظر کی جزئیات کو گاہے گاہے دیکھا تھا۔ اس کے کرداروں کا بھی فردعی مطالعہ کیا تھا۔ ان کی خوشیوں اور غموں کو اک اڑتی پھسلتی ہوئی نظر سے دیکھا بھی تھا۔ لیکن کبھی اس سارے منظر کو، اس کی عام جزئیات کو، ان تمام کرداروں کو ان کی تمام خوشیوں اور غموں کے ساتھ اس قدر متناسب اور مکمل نہ پایا تھا۔ جو چیز کبھی قاشوں میں، ٹکڑوں میں، چھوٹی چھوٹی جھلکیوں میں دیکھی تھی وہ آج ایک مکمل تصویر کی صورت

میں نظر آئی۔ یہ تصویر خوب صورت بھی تھی، بدصورت بھی۔ اس میں آنسو بھی تھے، قہقہے بھی۔ زندگی کی گہرائی بھی اور اس کا چھچھورا پن بھی۔ نفرت بھی اور مٹ جانے کے آثار بھی جو کسی عورت ہی کو نصیب ہو سکتی ہے۔ اور پھر ممیرے، چچیرے، خلیرے بھائی بہن، ان کی چاہتیں، ان کی رسوائیاں، لگاوٹیں، جلاپے۔ اس تصویر میں ایک مسلم گھرانے، ایک متوسط طبقے کے شہری مسلم گھرانے کی روح کھنچ آئی ہے۔ اس قدر صاف واضح کہ نقش اولین ہی نقش آخر معلوم ہوتا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں میں دو ایک اور نے بھی اس تصویر کو پیش کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ نہایت عمدہ طریق سے پیش کیا ہے۔ اور عصمت چغتائی سے پہلے پیش کیا ہے لیکن انھوں نے اسے ایک مرد کے زاویۂ نگاہ سے جانچا ہے اس لئے چند جزئیات غیر متناسب ہیں، چند خطوط غیر متوازی ہیں کیوں کہ مرد اکثر گھر کی چہار دیواری سے باہر رہتا ہے اور متوسط طبقے کے شہری مسلم گھرانے کی بہو بیٹی اکثر گھر کی چہار دیواری ہی میں زندگی بسر کرتی ہے۔ یہ گھر اس کی روح کا ملجا و ماوا ہے۔ اس کی فکری، روحانی، جسمانی زندگی کا مرکز ہے۔ اسی لئے تو عصمت کے افسانوں میں اس گھرانے کا حال اس قدر شدتِ تاثر کے ساتھ مرقوم ہے کہ پڑھنے والے کو افسانہ کے ماحول اور اس کے کرداروں سے ایک روحانی قرابت کا احساس ہوتا ہے اور وہ ان کے دکھوں، تکلیفوں اور مسرتوں کو انھیں خوشیوں اور صعوبتوں سے اس قدر ہم آہنگ کر لیتی ہے کہ کوئی حدِ فاصل نہیں رہتی۔ یہاں کرداروں کا ماحول اور ان کی زندگی اس کی زندگی سے ملحق معلوم ہوتے ہیں اور وہ متوسط طبقے کا مسلم گھرانا، اس کا اپنا گھر۔ اس لحاظ سے عصمت چغتائی کے افسانے بہت کامیاب ہیں۔

ان افسانوں کے مطالعہ سے ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے گھوڑ دوڑ۔ یعنی رفتار، حرکت، سبک خرامی اور تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے، کنائے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی پڑھنے والے کا ذہن اس قدر پیچھے رہ جاتا ہے کہ دل ہی دل میں وہ افسانہ نگار کو کوستا رہ جاتا ہے یعنی عورت کو بھی اس قدر بھاگم دوڑ

کیوں۔ ہمیں یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ سچ ہے یہ احساس شکست اور وہ بھی عورت کے ہاتھوں سے کیسے اچھا لگتا ہے۔ لیکن یہ بلاخیزی تندرست اور توانا انسان کے لئے صدائے جرس سے کم نہیں۔ اٹھو، کام کرو، جاگو، بھاگو۔ ہندوستان کی عورت اپنی روح میں بیداری اور بیداری کے ساتھ نسیم صبح گاہی تازگی اور توانائی محسوس کر رہی ہے۔ وہ عہد کہن کی تمام کلفتوں کو مٹا کر ایک نئی حرکتی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہے۔ ان افسانوں کے ذہنی تسلسل کی تیز رفتاری اس نئی زندگی کے خارجی پہلو کی آئینہ دار ہے۔ "بیمار" میں :

"اور پھر دندنا کر بخار چڑھتا اور گھگھی بندھ جاتی۔ معلوم ہوتا ہڈیاں چٹخ رہی ہیں اور کھال جھلسنے لگتی۔ گلے میں جیسے رہٹ چلنے لگتا۔ چوں چر۔ شٹر رو۔ کھٹر۔ اور پھر کھانسی کے پھندے پڑنے لگتے۔

بچے آنگن میں کلکاریاں مارتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا اس کے کلیجے پر گھن برس رہے ہیں۔ بس وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے دروازے دھڑ دھڑاتے نکل جاتے اور ان کی زندہ لاش سر سے پیر تک لرز جاتی اور پھر دوسری آوازیں، بھیانک بھونپو والی لاریاں، کوکتی ہوئی موٹریں، کھڑکھڑاتے تانگے اور منمناتی ہوئی سائیکلیں سب گویا اس کے سینے پر سے دندناتی ہوئی گزرتیں۔ "رام رام ست ہے" اس کا سینہ مسل جاتا"

"ٹنن ٹنن کوئی کالج کی لڑکی سائیکل اڑاتی آ رہی تھی۔ خواب پھر بدلے۔ کیا عجب سائیکلیں ٹکرائیں جیسے ستارے ٹکراتے ہیں اور پھر طوفان... گرج اور چمک، بیہوش حسینہ ..... مگر ..... وہ بریک ..... بریک لگا ہی نہیں۔ ایک ستارہ کا وہ دے کر نکل گیا۔ ایک گرا دھم سے گھٹنوں سے پاجامہ مسک گیا، گھٹنے چھل گئے۔ دوسرے ستارے کی ساری دُور موڑ پر ہوا میں لہرائی اور گم"

(اُس کے خواب)

میرے خیال میں کوئی حادثہ بھی اس برق رفتاری سے وقوع میں نہیں آتا کہ جس طرح عصمت چغتائی نے اسے بیان کیا ہے۔ سرعت، حرکت، رفتار مختصر افسانہ کا ایک اہم جزو ہے اور اس لحاظ سے مجھے اپنے کئی افسانے ٹھس معلوم ہوتے ہیں، ٹھیرے ہوئے پانی کی طرح رکے ہوئے۔

"کاش اس کا بس چلتا تو وہ بتاتا منحوس لڑکی۔ بڑی علم حاصل کر رہی ہیں۔ کچھ نہیں۔ کچھ پڑھنے وڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جنگلی ... ان سے سادھو کی لڑکی ہی ہزار بلکہ کروڑ درجہ اچھی تھی۔ دودھ تازہ چمکتی ہوئی پیتل کی لٹیا میں باچھوں میں بہہ رہا ہے۔ اس سے تو وہ سڑک کوٹنے والی ہی اچھی، گو اس کی کھال جھلس کر سائیکل کی گدی سے ملنے لگی ہے اور پنڈلیاں پھوڑوں سے لدی ہوئی ہیں اور دو منٹ پاس بیٹھ جاؤ تو جوئیں بلبلانے لگیں۔ مگر ذرا آنکھ جھپکاؤ مسکراہٹ کی بجلیاں تیار۔"

(اس کے خواب)

"ایک الماری کے بالائی تختے پر ایک گھڑی رکھی ہے چوڑی سی موٹی عورت کے چہرے کے مانند کڑک مرغی کی طرح کٹاک کٹاک کرتی رہتی ہے۔ یہ گھڑی اس گھر میں بالکل مالکہ مکان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جونہی دس بجتے ہیں گائے سینگ بدلتی ہے۔ نظام فلکی میں تبدیلی ہوتی ہے۔ کرسی کا پتلون ایک سپاٹے سے غائب ہو جاتا ہے۔ پائے پر رکھی ہوئی پسینہ دار بھوری ایڑی پھد سے زمین پر آ رہتی ہے۔ کپڑوں کی جھٹک پھٹک سنائی دیتی ہے، گویا فرشتے پھڑ پھڑا رہے ہوں۔ پھر زمین پر جوتیاں رینگنی شروع ہوتی ہیں معلوم ہوتا ہے پوری باٹا کمپنی کے جوتے پڑے مچل رہے ہیں۔ جوتوں کی گھس گھس سے آپ کے دانت کھسکھسا اٹھتے ہیں جیسے ان کے درمیان کوئی ریت کی چٹکیاں چھڑک رہا ہو۔"

(چھری میاں سے)

اور یہ راحت کی شان میں :

"راحت! آپ نے چند موم کی پتلیوں کو تو دیکھا ہوگا۔ ننھی منی کھیل کود کی شوقین، جن کا مقصدِ زندگی کھیلنا ہے۔ گڑیوں سے کھیلنا، کتابوں سے کھیلنا، اماں ابا سے کھیلنا اور پھر عاشقوں کی پوری پوری ٹیم سے کبڈی کھیلنا۔ ابھی میرے بدنصیب بھائی کے ساتھ ہنس کھیل کر آرہی تھی۔"

(جنازے)

"مکھیوں کی حملوں سے دکھی ہو کر آخر بڑھیا بھڑ بھڑا ہی اٹھی۔ یہ مکھی ذات جی کے ساتھ لگی تھی۔ پیدا ہوتے ہی گھٹی کی چپچپاہٹ سونگھ کر جو مکھیاں منہ پر بیٹھنا شروع ہوئیں تو کیا سوتے کیا جاگتے بس آنکھ ناک اور ہونٹوں کی طرح یہ بھی جسم کا ایک عضو بن کر ساتھ ہی رہتی تھیں اور ایک مکھی تو نہ جانے سالہا سال سے اس کی دشمن ہو گئی تھی۔ جب لکھنؤ میں تھی جب کاٹا۔ پھر جب اناؤ گئی تو برسات میں پھر کاٹا اور لوسندیلہ میں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اگر بڑھیا کو معلوم ہوتا کہ اسے اس کے جسم کے کون سے مخصوص حصہ سے انس ہے تو وہ ضرور وہ حصہ کاٹ کر مکھی کو دے دیتی مگر وہ تو ہر حصہ پر ٹہلتی تھی۔ وہ کبھی کبھی غور سے اس خاص کٹ کھنی مکھی کو دیکھتی۔ وہی چتلے پر، ٹیڑھی ٹانگیں اور مٹکا سا سر۔ وہ بڑے تاک کر پنکھے کا چھپا کا مارتی۔ مکھی تنن تنن کر کے وہ گئی۔"

(ساس)

ان ٹکڑوں کو بلند آواز سے پڑھیے اور پھران کی صوتی رفتار کا بھی اندازہ لگائیے۔ لیکن افسانہ میں اگر رفتار ہی رفتار ہو، سمت نہ ہو، نہج متعین نہ ہو تو افسانہ ایک وحشی ہرنی کی چوکڑی بن کر رہ جاتا ہے۔ "کیوں رے کتے" کی پڑوسن برجو کی طرح جو الھڑ اور لاابالی ہے اور جو زندگی کے دھارے پر آپ ہی آپ بہے چلی جا رہی ہے اور جسے نہ اس کی

رفتار کا اندازہ ہے نہ سمت کا۔

"پلنگ کی ادوانوں اور بانوں کے جھینگوں کا ذکر ادھ سنا ہی چھوڑ کر وہ برآمدہ میں آگئی۔ باہر پڑوسن کے دو بچے کھڈیوں پر بیٹھے کسی نہایت دلچسپ مسئلہ پر لڑ رہے تھے۔ دور ایک گائے کھڑی کوڑا کھا رہی تھی۔ برجو الجھ کر برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں کو دیکھنے لگی۔ دو ایک خوش رنگ پھول توڑ کر اس نے اپنی لمبی چوٹی کے بالائی سر میں اڑس لئے اور نیچے کیاریوں میں سے دھنیے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی۔ بڑے سگھڑاپے میں آکر اس نے منڈیر پر اگی ہوئی بیکار گھاس کو نوچ کر الگ کر دیا۔"

(کیوں رے کتے)

یہاں برجو کے داخلی اور خارجی افعال کی کوئی سمت نہیں۔ وہ یوں ہی اکتائی ہوئی سی گھوم رہی ہے اور اگر اس طرح افسانہ بھی کسی سمت کے بغیر گھومنے لگے تو افسانہ کے سب اجزائے ترکیبی پریشان ہو جاتے ہیں اور نتیجہ ایک اچھے افسانے کی صورت میں نہیں بلکہ ایک ذہنی انتشار کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ بظاہر جب عصمت چغتائی کا کوئی افسانہ شروع کیا جائے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کمبخت افسانہ کی کوئی سمت نہیں۔ "اس کے محور کا کوئی پایہ سیدھا نہیں لیکن جوں جوں افسانہ پڑھتے جائیے اس پر چوکڑیاں بھرتی ہوئی وحشی ہرنی کی سمت واضح ہو جاتی ہے۔ وہ عام افسانوی رہ گذر سے ہٹ کر ایک نئے جنگل میں جا رہی ہے۔ ایک نئے مرغزار میں، نئے اشجار، نئے طیور، نئے افق کہ آدمی یکایک ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو افسانہ کے قریب اختتام ہونے تک اس کی سمت کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر یکایک سارا افسانہ اس تیزی سے گھوم کر حرف مطلب پر واپس آتا ہے کہ یکایک پڑھنے والے کی حیرت مسرت میں مبدل ہو جاتی ہے۔ ساری جزئیات صحیح، روشن، متناسب اور برمحل معلوم ہوتی ہیں۔ جذبات کردار سے اور کردار ماحول سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی فنی صناعی کی بہترین مثال

"بھول بھلیاں" ہے۔ بھول بھلیاں کے اس جنگل میں پڑھنے والا فکری اعتبار سے بار بار بھٹکتا ہے۔ اس کے درختوں اور جھاڑیوں سے بار بار الجھتا ہے، جھنجلاتا ہے، چلاتا ہے، کوسنے دیتا ہے۔ نہ صرف فکری اعتبار سے بلکہ خارجی نقطۂ نگاہ سے بھی عصمت چغتائی نے اس افسانہ کی انشا میں، اس کے فقروں کی نشست و برخاست میں، اس کے مختلف نثری ٹکڑوں کی تدریجی ارتقاء میں اس صناعی کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور سب سے آخری افسانہ کے آخری چند فقروں میں جب حرفِ مطلب ایک بجلی کی لپک کی طرح کوندتا ہے، افسانہ کی نہج مکمل طور پر روشن ہو جاتی ہے۔ سمت کو چھپانے میں پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں گم کر دینے میں اور پھر یکایک آخر میں اس اضطراب اور حیرت کو مسرت میں مبدل کر دینے کی صنعت میں عصمت اور منٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اس فن میں اردو کے بہت کم افسانہ نگار ان کے حریف ہیں۔

پھر یہ سمت کیا ہے؟ کیا یہ سمت معکوس تو نہیں؟ کیا یہ آگے بڑھنے کے بجائے "ماضی کی طرف لوٹو" کی پیغامی علامت تو نہیں؟ کیا عصمت اور دوسرے کئی ایک افسانہ نگاروں کی طرح رومان کے مرمریں قصر میں محبوس ہو جانا پسند کرتی ہیں۔ جہاں ماضی کی ہر چیز اُجلی، نکھری اور سونے کی طرح خوبصورت اور شفق کی طرح گلگوں نظر آتی ہے۔ لیکن عصمت چغتائی کے یہاں عہدِ کہن کی وہ دھندلی دھندلی میٹھی میٹھی یاد نہیں جو قدامت پرستوں کی آنکھوں کو ڈبڈبا دیتی ہے۔ وہ ایک سسکی لے کر نمناک آواز میں کہہ اٹھتے ہیں۔ آہ! وہ کیا زمانہ تھا، وہ کافوری شمعیں، وہ چلمن کی اوٹ، وہ مینائے ناز، وہ ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی، یا رومان پرستوں کی وہ تخیل آفرینیاں، جن پر بقول مولانا صلاح الدین "حقیقت خندہ زنی کرے اور مشاہدہ اپنا سر پیٹے"۔ عصمت چغتائی کے یہاں اس قسم کی پیغامیت اور جذباتیت نہیں۔ وہ پرانی قبروں کی پرستش نہیں کرتیں، جیتے جاگتے انسانوں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ وہ ارمان کے تخیلی ہیولے تیار نہیں کرتیں بلکہ حقیقت کو اپنے تخیل کی شفاف آگ میں پگھلا کر اپنی زبان کے تیز و تند اور

تلخ تیزاب میں اتار کر ایسے جاندار مرقعے تیار کرتی ہیں کہ جہاں پڑھنے والا افسانہ نگار کی چابکدستی اور فن کاری کی داد دیتا ہے وہاں اپنی اور اپنے سماج کی شکل پر بسورتا رہ جاتا ہے۔ اس لئے مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے جب لوگ عصمت چغتائی کو گالیاں دیتے ہیں کیوں کہ وہ لوگ دراصل اس وقت اپنے آپ کو گالیاں دے رہے ہوتے ہیں۔ اپنی اس مکروہ عفونت کو جسے وہ روحانیت کی خوشبوئیں لگا کر چھپانا چاہتے ہیں۔ اس جنسی بھوک کو جسے عصمت نے جگہ جگہ اپنے افسانوں میں عریاں کیا ہے اور جسے یہ سماج ایک جھوٹی شرافت اور مذہبیت کی تہوں کے نیچے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے، عصمت نے جگہ جگہ سماج کی اس مکاری اور ابلہ فریبی کو بے نقاب کیا ہے۔ اور ایک ایسی بے پناہ طنزیہ اندازِ نگارش سے کام لیا ہے جو برے کی طرح چھیدتی چلی جاتی ہے۔ دوزخی میں خود عصمت نے اس طرزِ نگارش کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے:

"دنیا بدل گئی ہے۔ خیالات بدل گئے ہیں۔ ہم لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہم دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری، سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلس دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔"

(دوزخی)

"جی ہاں، پنکچر ہو گیا شاید!" میں نے معصومیت سے کہا۔

"واقعی!" وہ بے ہنگم سا لمبا انسان مذاق اڑانے کے لہجہ میں بولا۔

"جی ہاں کوئی کانٹا چبھ گیا شاید!" میں نے معصومیت کی دال نہ گلتے دیکھ کر اونچی اور کھری آواز میں کہا۔

"واقعی!" پھر وہی کمینہ، تمسخرانہ گفتگو۔ کاش، کوئی اسے خواتین سے گفتگو کرنے کا سلیقہ سکھاتا۔ (کاش کبھی ہندوستانی نوجوان خواتین سے

اس غیر رومانی انداز میں گفتگو کر سکتے ۔)

"اس سے آپ کا مطلب ؟"

"یہی کہ شوق ـــــ آپ لوگوں کو ذرا شوق ہوتا ہے کہ جہاں کوئی رومنٹک جگہ دیکھ لی اور کوئی حادثہ لے بیٹھے۔ پنکچر ہو رہے ہیں، دریا میں ڈوبی جا رہی ہیں، بدمعاش لئے جاتے ہیں۔ جہاں دیکھو" (پنکچر)

اور ایک کنارے اسکول ماسٹر کے جنسی خواب جن میں شاید سینکڑوں افسانوں کے آغاز اور انجام کروٹیں لے رہے ہیں۔

"خواہ وہ جنگل کتنا ہی حسین اور سریلا کیوں نہ ہو یہ لازمی ہے کہ وہاں ایک حسین لڑکی ہو، بے حد حسین، بھلا سادھو کی لڑکی جنگل میں دریا کے کنارے کنول توڑ رہی ہو اور سیاہ کٹھری اور چیتھڑ ہو تو بے اختیار یہی جی چاہے گا کہ چڑیل کو پانی میں ڈبو دو۔

خیر تو اس کے جنگل کے سادھو کی لڑکی بھی حسین ہوتی۔ اب یا تو وہ گھوڑے پر سے گر پڑتا اور وہ لڑکی اس کا سر زانو پہ رکھ کر ہوش میں لاتی۔ یا پھر وہ پیاسا ہوتا اور کٹی میں جاتا، اور سادھو اپنی حسین منو رما، آشا یا روپا جو کچھ بھی ہوتی اسے پکارتا اور وہ بجلیاں گراتی، آنچل کے شعبدے دکھاتی آتی۔ اور لٹیا گلاس میں تازہ بکریوں کا دودھ دوہ کر لاتی۔ شرمانا اس کے لئے ضروری ہوتا اور اس کے جسم میں بجلی کوندانے کو اس کی پتلی انگلیاں شرطیہ طور پر چھو جاتیں۔ اور جب یہ معاملہ ہو تو انجام معلوم ہی ہے"۔

عصمت کے ہاں موضوعات کی کمی نہیں "کیوں رے کتے" اور "بن بلایا مہمان" ہندو مسلم مناقشات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ "ایک شوہر کی خاطر" اور "سفر میں" ریل کے ڈبوں سے متعلق طنزیہ خاکے ہیں۔ "بیمار" میں سل کے ایک قریب المرگ مریض اور اس کی نوجوان بیوی کا نفسیاتی موازنہ

ہے۔ "تل"، میں ایک ادھیڑ عمر کے مصور اور اس کی ماڈل بھکاری رانی کے دو متضاد اور مخالف کردار پیش کیے گئے ہیں جس میں "آرٹ" اور "جنس" کے تاثرات لاشعور کی لہروں پر متصادم اور "دست و گریباں" نظر آتے ہیں اور "پنکچر" اور "بھول بھلیاں" محبت اور معاشرتی شادی سے متعلق ہیں۔ اور ان دو افسانوں میں عصمت چغتائی کی بیغامیت روایتی شادی پہ محبت کو اور رسمی ایجاب وقبول پر دلی رفاقت کو ترجیح دیتی نظر آتی ہے۔ لحاف میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ایک نوجوان اور شریف عورت ایک بے تجربے خاوند کے پلّے باندھ دی جائے تو وہ اپنی زندگی کس طرح گزارتی ہے۔ (یہ افسانہ پڑھ کر اکثر لوگ چونک پڑتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں!)

"ساس"، میں وہی ازلی، ابدی، دوامی ساس ہے جو ہندوستان کے ہر گھر میں موجود ہے اور جس کی شفقت اور جس کا غصہ اور جس کی کھاؤں کھاؤں ہر زمانہ میں شب و روز گونجتی ہے۔ "دوزخی" شخصیت سے قطع نظر ایک دائم المریض ہستی کے کردار کا مطالعہ ہے اور اتنا سچا، اتنا جھوٹا، اتنا بے رحم، اتنا نرم ونازک، اتنا پیارا، اتنا برا، اتنا خوبصورت اسکیچ اردو میں اور لکھا ہی نہیں گیا لیکن موضوعات کی اس فراوانی کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ عصمت چغتائی کے افسانوی جوہر کا مرجع ایک متوسط طبقے کا گھر ہے۔ یہاں مزدور اور کسان نہیں بستے۔ نہ ہی سیٹھ اور سر خان بہادر۔ اس میں مذہبیت بھی ہے اور گھٹا گھٹا ماحول بھی۔ پردہ بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ شرم بھی ہے اور بیباکی بھی۔ کالج کی لڑکیوں کی چہلیں ہیں اور برادرانِ نسبتی، ساس، دلہن، نند، بھاوج کی آویزش اور سارا تضاد اور وہ ساری خوبصورتی اور بدصورتی (خوبصورتی کم اور بدصورتی زیادہ) جن سے ایک متوسط طبقے کا گھر بنتا ہے، ان افسانوں میں موجود ہیں۔ یہ دنیا چھوٹی نہیں، آپ کے گھر کی دنیا ہے۔ ایک عورت کی دنیا۔ محیط میں سمندر کی سی وسعت ہو نہ ہو، سمندر کی سی پایابی ضرور موجود ہے۔ ان افسانوں کو مصنفہ نے ایک عورت کے سے حسنِ انتظام اور سلیقے سے سجایا ہے۔ سیدھی سادی زبان جو کم و بیش شمالی ہند کے ہر گھر میں سمجھی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نسوانی تشبیہیں اور محاورے اور استعارے، شوخیاں اور چٹکیاں جو آپ ہی آپ اس نگار خانے

میں خوبصورت گل بوٹے بناتی جاتی ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور پھر افسانے کے کلی تاثر میں بھی معتد بہ اضافہ کرتی ہے، اس کی زینت کو دوبالا کرتی ہے۔ اس کی آب و تاب کو جلا دیتی ہے، اس طرح کہ ہر افسانہ ایک ترشے ترشائے ہیرے کی طرح درخشندہ نظر آتا ہے۔

پہلے پہل جب عصمت کے افسانے اردو رسائل میں شایع ہوئے تو یار لوگوں نے کہا:

"اجی کوئی مرد لکھ رہا ہے ان افسانوں کو۔ ہماری شریف بہو بیٹیاں کیا جانیں افسانے کیسے لکھے جاتے ہیں۔"

لیکن جب عصمت برابر افسانے لکھتی رہیں اور افسانے لکھنے پر مُصر رہیں تو ارشاد ہوا:

"اجی ہٹاؤ بھی۔ وہ کیا لکھیں گی سٹرن کہیں کی۔ بس جب دیکھو جلی کٹی سناتی ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ ایسی بھی کیا عریانی"...

پھر وہ دور آیا "ہاں اچھی ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں کی صف اوّل میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ (یہ اب اردو میں صف اوّل کی نئی بدعت پیدا ہوئی ہے۔ افسانہ نگاروں سے لے کر فاسفورس کے تیل تک ہر چیز ان دنوں صفِ اول میں شمار کی جاتی ہے، تولی جاتی ہے، بیچی جاتی ہے۔) عورتوں کی نفسیات کو خوب سمجھتی ہیں" (یہ عورتوں کی نفسیات بھی خوب رہی۔) وغیرہ وغیرہ۔

اور اب! اب یہ حال ہے کہ عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔

لکھنؤ
یکم نومبر ۱۹۴۲ء

کرشن چندر

بھول بھلیاں

"لِفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ۔ کوئیک مارچ !" اڑا اڑا دھم !! فوج کرسیوں اور میزوں کی خندق اور کھائیوں میں دب گئی اور غل پڑا۔

"کیا اندھیر ہے۔ ساری کرسیوں کا چورا کئے دیتے ہیں۔۔ بٹی رفیعہ ذرا ماریو تو ان مارے پیٹوں کو"۔ چچی ننھی کو دودھ پلا رہی تھیں۔

"میرا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ بمشکل مجروحین کو کھینچ کھانچ نکالا۔ فوج کا کپتان تو بالکل چوہے کی طرح ایک آرام کرسی اور دو اسٹولوں کے بیچ میں پچا پڑا تھا۔

"آں ۔ ۔ ۔ ۔ آں صلّو بھیا نے کہا تھا فوج فوج کھیلو"۔ رشید اپنی کاغذی ٹوپی سیدھی کرنے لگے اور منّو اپنے چھلے ہوئے گھٹنے کو ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے گھور گھور کر بسور رہے تھے۔ اچھن، چچا جان کے کوٹ میں سے باہر نکلنے کے لئے پھڑپھڑا رہے تھے اور ان کا مفلر بری طرح پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر کپتان صاحب ویسے ہی ڈٹے کھڑے تھے۔

"یہ ہو کیا رہا تھا؟" میں نے کپتان صاحب کی سیاہی سے بنی ہوئی مونچھوں کو دیکھ کر کہا۔

"صلاح الدین اعظم رچرڈ شیر دل پر چڑھائی کر رہا تھا، منّو کو ہنسی آ گئی اور وہ

لپٹ گیا۔ "پھر کالی کرسی کھسک گئی اور بس"۔ کپتان صاحب نہایت احتیاط سے مونچھیں تھپکتے ہوئے بولے۔

"اچھا۔ اور یہ اچکن"۔

"یہی تو پر چرڑ ہیں، اور کیا، شیر دل، یہ مفلر دیکھو ان کا، یہ شیر دل کے بال ہیں"۔

"اور جناب؟" میں نے چار فٹ کے کپتان کو نظروں سے ناپا۔

"ہم صلاح الدین اعظم"۔ وہ اکڑتے ہوئے چلے۔

"اور بھئی یہ میرا کوٹ تو اتارو، سیاہی لگ گئی تو خدا کی قسم ٹھوکوں گی"۔

"اوہو۔ آپ کا کوٹ۔ بات یہ ہے کہ اس کے بالوں دار کالر کو۔ ۔ ۔ تو لیجئے نا اپنا کوٹ"۔

○

"رفو باجی ذرا یہ سوال بتا دیجئے"۔ ضلو اپنی سلیٹ میری ناک کے پاس اڑا کر بولے۔

"نا بھئی میں اس وقت سی رہی ہوں ذرا"۔

"پھر ہم آپ کو سینے بھی نہیں دیتے"۔ ضلو نے میرے پیروں میں گدگدیاں کرنا شروع کیں۔

میں نے پیر سمیٹ لئے تو وہ میری کمر میں سر اڑا کر لیٹ گیا۔ اور بکنا شروع کیا۔ "پھٹ جائے اللہ کرے جھیر جھیر ہو جائے یہ کرتا۔ سوال تو بتاتی نہیں لے کے کفن سیے جا رہی ہیں اپنا"۔

"چل یہاں سے پاجی ورنہ سوئی اتار دوں گی"۔ اور وہ وہاں سے ہٹ کر میری البم الٹ پلٹ کرنے لگا۔

"یہ کون ہیں چڑیل جیسی ۔ ۔ ۔ ۔ کالی مائی ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ضلو بھیا رکھ دے میری چیز میں"۔ میں نے سوچا جن ہے یہ تو۔

"تو پھر سوال بتاؤ"۔ اور وہ پھر میرے پاس گھس کر بیٹھ گیا۔

"ارے ذرا ہٹ کر، گرمی کے مارے ویسے ہی ابلے جا رہے ہیں"۔

"تو میں کیا کروں"۔ اور وہ مجھ سے اور لپٹا۔

"میری باجی کیسی ــــ ہاں گڑیا ذرا بتا دو پھر سوال"۔

"مجبوراً میں نے سوال کرنا شروع کیا۔

"اب یہ سوال سمجھا جا رہا ہے یا میرے بندوں کا معائنہ ہو رہا ہے"۔ اور وہ جلدی سے سلیٹ پر جھک گیا۔ میں بتا رہی تھی اور وہ بیوقوفوں کی طرح میرا منہ دیکھ رہا تھا۔

"اونہہ"۔ میں چڑ گئی۔ "پڑھ رہے ہو یا منہ تکنے آئے ہو، صلّو دق نہ کرو۔ ورنہ چچی جان سے کہہ دوں گی"۔

"آپ کی تصویر بنا رہا ہوں۔ یہ دیکھئے، آپ کے ہونٹ بولنے میں ایسے ہلتے ہیں جیسے ..... جیسے ــــ پتہ نہیں کیا۔ بس ہلتے رہتے ہیں ــــ" شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

"بھاگ یہاں سے الّو"۔ میں نے سلیٹ دور پھینک دی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا الگ بیٹھ گیا۔ اور میں اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں کہ چلے آ رہے ہیں اپنا بستر بوریا سنبھالے۔ یا اللہ خیر!۔

"کیوں، تم پھر آ گئے یہاں"۔

"اور کیا۔ وہاں دل جو گھبراتا تھا"۔ اور وہ پھر میرے پاس بیٹھنے لگا۔

"صلّو اگر تم مانو گے نہیں تو ....."

"تو ..... تو ..... ای ....." اس نے منہ چڑایا۔ "ہم تمہارے پاس بیٹھتے ہیں تو اچھا پڑھا جاتا ہے"۔

"اچھا تو چپکے بیٹھو۔

صلاح الدین میرے چچا کا اکلوتا سپوت تھا۔ پھوٹی آنکھ کا یہی تو ایک تارا تھا اتنی لڑکیاں پیدا ہوئیں کہ چچا چچی بولا گئے۔ اور پھر آپ تشریف لائے۔ جناب کی انگلی دکھے تو بکرے صدقے کئے جانے لگیں۔ منتیں مانی جائیں، گھر میں کوئی زور سے نہ بولے۔ جوتے اتار کر چلو، برتن نہ کھڑکے۔ لاڈلے کی آنکھ کھل جائے گی۔ گھر میں اسی لئے کوئی کتا نہ بلّی مرغیاں نہ رکھی جائیں کہ ننھے میاں کی کبھی نیند نہ خراب کر دیں اور ہم بیچارے نہ لاڈ جانیں نہ لاڈ کریں۔ پھر بھی ماں بہنوں کا لاڈ اسے کچھ کڑوا لگنے لگتا تھا۔ اور وہ سارے وقت مجھی سے الجھتا۔ لوگوں کے "نان وائلنس" سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ یہی بات تھی کہ وہ جان جان کر مجھے چھیڑتا۔ کیونکہ میں اسے بری طرح ڈانٹ دیتی اور کبھی کبھی چپت بھی رسید کر دیتی۔

لاڈلے پوت دبلے اور سوکھے تو ہوتے ہی ہیں اور اوپر سے پتلا بانس جیسا قد۔ اماں تو نظر بھر کے نہ دیکھتیں، انھیں ڈر تھا کہیں اونٹ صاحب کو نظر نہ لگ جائے، اور یہاں یہ کہ جہاں لمبی لمبی ٹانگیں پھینکتے آئے اور چھیڑنے لگے۔ یہ عادت سی ہو گئی تھی کہ کالج سے آئے اور اماں کو بلائیں دے کر اور دادا کو نبض دکھا کر سیدھے میری جان پر نزول۔ کیا مجال جو گھڑی بھر نچلا بیٹھے یا بیٹھنے دے۔ بہنوں کو چھیڑنا کسی کے گدگدی کی کسی کے گلے میں جھول گئے۔ کسی کے کندھے میں کاٹ لیا۔ میرے پاس آئے اور میں نے تھپڑ دیا۔

گھنٹوں ماں بہنیں بیٹھ کر ارمان بھرے ذکر کیا کرتیں۔ ہر دلچسپ اور پُر مسرت بات صلو میاں کی شادی کے لئے اٹھا کر رکھ دی جاتی۔

"صلو کی شادی میں بناؤں گی۔ سب کی گوالیر کی چندیری کی ساڑھیاں اور یہ بھی میں تو دہلی جا کر کروں گی سہیل کی شادی کی طرح اپنے دونوں طرف کے مہمان آ گئے اور بس۔ اس گھر میں تو ......"

"اور اماں اسے بلائیں گے لیلا ڈیسائی کو ناچ کے لئے"، ایک بہن بولی۔

"بھئی ہم تو سہرا وغیرہ سب باندھیں گے۔ زربفت کی اچکن ماموں ابا جیسی اور۔۔۔۔۔"

بہنوں کے لیے بھائی تھا گویا جگمگاتا ہوا ہیرا! میری اندھی آنکھوں میں جیسے اور چھ سات بھائی تھے یہ بھی لڑنے جھگڑنے، توتو میں میں کرنے اور بات بے بات رعب جمانے والی ایک ادنیٰ ہستی تھی۔ میں ان کے ارمان بھرے دلوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات سے کملا جاتی۔ کاش میرے بھی اتنے بھائیوں کے بجائے ایک ہی ہوتا۔ ایک دبلا پتلا، آئے دن کا مریض، چمنا، لڑاکو، کتنا رونتک معلوم ہوتا۔

"باجی ذرا کرتے میں یہ بٹن ٹانک دو"۔ وہ اپنی پتلی گردن آگے بڑھا کر بولا "چٹ پٹ ٹانکو، مجھے میچ میں جانا ہے" ـــــ میں ناول کے ایسے حصے پر پہنچ گئی تھی جہاں ہیرو ہیروئن کے بازوؤں تک پہنچ چکا تھا۔ بھلا اس قدر غیر رومانی کام میں میرا کیا جی لگتا۔

"رابعہ سے کہو وہ ٹانک دے گی"۔

"نہیں ہم تو تم سے ہی ٹکوائیں گے"۔

"میرے پاس سوئی بھی نہیں"۔

وہ دوڑ کر چچی جان کی پچی اٹھا لایا "لو یہ سوئی"۔

"تاگہ پرو"۔

"لاؤ میں پرو دوں"۔ چچی سروتہ چھوڑ کر بولیں۔

"میں تو انھیں سے ٹکواؤں گا۔ لو سوئی"۔

مجھے غصہ آگئی۔ "راشدہ سے ٹکواؤ"۔ ہیرو آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے آخری دو لائنیں پھر سے پڑھنا پڑیں۔

"نہیں ہم تو تم ہی سے ٹکوائیں گے۔ رکھو کتاب ادھر، ورنہ پھاڑ دوں گا"۔

"پھاڑ ہی۔ بھاگ جاؤ نہیں ٹانکتے ـــــ" میں نے کتاب دوسری طرف موڑ لی۔ اسے

بھی ضد آگئی۔

"آج یا تو تم سے بٹن ٹنکواؤں گا یا اپنا تمہارا خون بہا دوں گا"۔

"چل ہٹ بڑا وہ ہے نا۔ بہاؤ نہ بہاؤ اپنا خون"۔

ہیرے کی کنی کے خون بہانے کے ارادے ہی کو دیکھ کر بہنیں لرز گئیں، ان کا بس چلتا تو وہ بٹن کی جگہ اپنی آنکھیں ٹانک دیتیں۔

"صلّو لاؤ میں ٹانک دوں ذرا سی دیر میں"۔ راشدہ بولی۔

"کہہ دیا صلاح الدین اعظم ایک جو کہہ دیتے ہیں وہ ٹلتی نہیں —— دیکھو باجی ٹانکتی ہو یا ......"

"یا کیا؟" میں نے تیوریاں چڑھائیں۔

"یہی کہ میچ دیکھنے نہیں جاؤں گا اور ایک لفظ کتاب کا نہیں پڑھنے دوں گا اور موقع ملنے پر کتاب پار کر دوں گا —— اور .... اور ...."

مجھے ہنسی آگئی۔

"اوہو۔ لو بس تو پھر پیاری سی بجّو کی طرح ٹانک دو"۔

میں نے بھی سوچا وبال کاٹوں۔ میں نے تو بٹن ٹانکنا شروع کیا اور وہ مجھے دق کرنے لگا۔

"دیکھو صلّو میرا ہاتھ ہل جائے گا تو سوئی کلیجہ میں اتر جائے گی"۔

"اتر جانے دو"۔ اور اس نے پھر گدگدی کی۔

میں نے سوئی مذاق میں چبھونا چاہی۔ وہ جلدی سے ہٹا۔ دھکے سے نہ جانے کیسے سوئی کی نوک چبھ گئی۔ خون بھی نکلا اور غضب یہ کہ نوک غائب۔ سنتے ہیں کہ سوئی کی نوک خون میں کھو جاتی ہے دل میں جا پہنچتی ہے، دم نکل جاتا ہے۔

"ارے نوک"۔ میرے منہ سے پریشانی میں نکلا۔

"میرے سینے میں اتر گئی۔ اور اب خون میں چلی جائے گی۔ اور پھر... پھر دل میں آجائے گی.... لو اماں جان ہم تو چلے"

چچی جان کو سکتہ ہو گیا۔ مگر وہ سنبھلیں اور چیخیں۔ اور رابعہ چیخی اور راشدہ چیخی میرا یہ حال کہ مجرم کی طرح سوئی پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ صلاح الدین سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور لاچاری سے گریبان ٹٹولنے لگا۔

پھر جو ہلڑ مچا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ مجھ پر کیا کچھ گذری۔ ڈاکٹر، حکیم اور نمازیں اور میرا دل چاہے ڈوب مروں۔ آخر میں نے مذاق کیا ہی کیوں، اور وہ بھی اس کانچ کے گلاس سے ______"

کیا بتاؤں کیسی پشیمانی ہو رہی تھی۔ ایکس رے ہوا۔ سارے جسم میں سوئی ڈھونڈ ڈالی مگر خاک پتہ نہ چلا۔ اور بھی مصیبت۔

چچی جان کے آنسو۔ اور رابعہ، راشدہ کا ٹہل ٹہل کر دعائیں مانگنا اور اوپر سے صلو کا اترا اترا کر مرنے کی دھمکیاں دینا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ صلو نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"اب تو چین آگیا آپ کو۔"

میں نے سر جھکا لیا۔

"اچھا یہاں آئیے۔ ذرا میرے سر میں تیل تھپک دیجئے۔"

بھلا اب مجھ میں ہمت کہاں تھی جو انکار کروں۔ چپ چاپ سر میں تیل ڈالنا شروع کیا۔ صلو فتح مندانہ انداز سے مجھے آنکھیں چڑھا چڑھا کر دیکھتا اور مسکراتا رہا۔

"دیکھا میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ؟" وہ میری انگلی میں چٹکی نوچ کر بولا۔ "سوئی تو میرے گریبان ہی میں رہ گئی تھی۔"

غصہ کے مارے میرا خون کھول گیا۔

"اچھا جانے دو۔ اماں جان کاہے کو مانیں گی۔ میں نے سوئی پھینک بھی دی" میرے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ اور ہنسا۔

"اچھا باجی تجھے بھی اس کی سزا نہ ملی تو...... خیر" میرا جی چاہا اس کے بال نوچ کر دور دھکیل دوں۔ "خدا سمجھے......"

"مجھے تم سے کام کروانے میں مزہ آتا ہے۔ جب میں نوکر ہو جاؤں گا تو تمھیں اپنے پاس رکھوں گا"

"ہوش میں، میری جوتی رہتی ہے تیرے پاس"۔

"دیکھ لینا۔ میں تمھیں لے لوں گا ـــــ گود لے لوں گا ـــــ ہنستی کیوں ہو" مجھے ہنسی آ گئی۔

"اور پھر تمھیں ہوائی جہاز میں بٹھاؤں گا۔ ہاں..... !" وہ آنکھیں گھما کر بولا۔

O

میرے امتحان کے دن آ گئے تھے۔ اور میں کمرہ بند کر کے پڑھا کرتی۔ مگر صلو کہیں نہ مانتا تھا۔ جہاں میں پڑھنے چلی اور وہ بھی موجود۔ میں نے سنجیدگی سے منع کر دیا کہ "اگر تم نے دق کیا تو میں بورڈنگ چلی جاؤں گی"۔ پڑھنے کے خیال سے چچا میاں کے گھر رہنا پڑا تھا۔

وہ خاموش پڑھا کرتا۔ مگر گھنٹہ آدھ گھنٹے بعد بے چینی ہونے لگتی۔

"اب بھائی انٹرول ہو گا" وہ کتاب بند کر کے میرے پاس آن گھستا۔ اور دس منٹ تک وہ ادھم مچتا کہ خدا کی پناہ۔ شرارت میں اسے کاٹنے کا مرض ہو گیا تھا۔

"بات یہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ تمھیں کھا جاؤں"۔ وہ ہنس کر دانت پیستا۔

"خود اپنی بوٹیاں چبا ڈالو"۔ مگر وہ بری طرح لپٹ جاتا، اور باوجود ڈھکیلنے کے تنگ کئے جاتا۔ کبھی مجھے غصہ آ جاتا۔ لیکن عموماً اگر وہ کمرے میں نہ ہوتا تو کسی چیز کی کمی سی

محسوس ہوئی۔ گھر کی ساری چہل پہل اسی ایک انسان کے دم سے تھی۔ بچّوں کو چھیڑنا، ہنونوں کو رلانا، کبھی پھر فوراً لپیٹ کر پیار کرنا اور منا لینا۔

○

امتحان ختم ہو گئے۔ اور گھر جانے کے خیال سے خوشی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہو رہا تھا۔

"کیوں جا رہی ہو چھٹیوں میں"۔ وہ ایک دن بولا۔

"واہ میری اماں بیچاری اکیلی ہیں"۔

"اکیلی! جیسے انھیں بڑی تمھاری پرواہ ہے"۔

"ہوں، اور نہیں تو تمھیں پرواہ ہوگی"۔

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ "سچ کہتا ہوں بجو.... سچ کہتا ہوں۔ تم نہ جاؤ"۔ اس نے پیار سے میرے کندھے پر سر رکھ دیا اور اپنی سوکھی باہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔

"ہٹو تو.... خیر ہو گی تمھیں میری پروا۔ مگر اب تو جاؤں گی"۔

"مگر میں کہتا ہوں کہ مت جاؤ"۔ وہ ذرا ہٹ کر بولا

"بکواس مت کرو۔ جاؤ ذرا کسی کو بھیجو میرا سامان باندھ دے"۔

"اور میں کہتا ہوں تم نہیں جا سکتیں"۔

"ہنھ! بڑے لاٹ صاحب ہو نا جو روک لوگے"۔

"یاد ہے وہ سوئی"۔ وہ شرارت سے مسکرایا۔

"مکّار ہو تم .... کہیں کے"۔

○

دوسرے دن صلو کو بخار چڑھا۔ سارے گھر پر جیسے آفت ٹوٹ پڑی۔ ذرا سا ملیریا اور یہ اودھم! مگر دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔

"اماں جان۔ بجّو کو روک لیجئے آپ سے اکیلے تیمارداری نہ ہو سکے گی"۔ جیسے سور کو بڑی تیمارداری کی ضرورت تھی!

"اے میاں بھلا وہ کیوں رکیں گی"۔ چچی اماں طعن سے بولیں۔"میں حمیدہ کو تار دے کر بلالوں گی"۔

"نہیں اماں وہ اپنے بچے لے کر آن دھمکیں گی تو اور غل مچے گا۔ بجّو تو خود رک رہی تھیں۔ اسکول میں پارٹی ہے۔ دوسرے جب ہم اچھے ہو جائیں گے تو سنیما دیکھنے چلیں گے"۔

"رک جاؤ نا کیا حرج ہے"۔ رابعہ نے رائے دی۔ اسے چڑیل کو کیا پتہ کہ یہ مکاری کر رہا ہے۔ بخار تو اتفاق سے آگیا۔ ورنہ وہ کچھ اور فیل مچاتا۔ رکنا ہی پڑا۔

"صلاح الدین اعظم کا حکم"۔ وہ شرارت سے مسکرایا۔"میرے مونچھیں نکل آئیں تب تمھارے اوپر اصلی رعب پڑا کرے گا۔ لو اسی بات پر ذرا سی برف چھل کر تو کھلا دو"۔ چچی جان نے اس قدر ڈری ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں جلدی سے تولیہ میں برف توڑنے لگی۔ کسی کا لاڈلا ہو تو ہم کیوں کھنچیں۔ مگر وہ تو بھگتنا پڑا۔

"بجّو..... بجّو..... "کسی نے آہستہ سے مجھے پکارا۔

"کیا ہے ؟" میں ڈر گئی۔

"ذرا سا پانی"۔ صلو نے اپنے پلنگ سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ میں جلدی سے اٹھی۔ اندھیرے میں تھرماس ٹٹول کر پانی نکالا۔

"اماں تھکی ہوئی ہیں..... بیٹھ جاؤ"۔ اس نے سرہانے مجھے بٹھا لیا۔ اور آہستہ آہستہ گلاس میں برف ہلانے لگا۔

اسے میری طرح پسینہ آرہا تھا اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ پانی پی کر وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"بجّو!"

"کیا ہے ؟"

"میرا دل گھبرا رہا ہے"۔

"چچی جان کو جگاؤں"۔ میں نے چاہا آرام سے اس کا سر تکیہ پر رکھ دوں۔

"نہیں ..... ہلو مت!" اس نے اپنے پتلے پتلے ہاتھ میری کمر میں ڈال دیئے۔
دل گھبرا رہا ہے۔ بجّو!" وہ تیزی سے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اپنے کو چھڑانے کی کوشش نہ کی اور اس کی پیشانی پوچھنے لگی۔ وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی میرا نام لے کر بڑبڑانا شروع کیا۔ سبکیاں! وہ سبکیاں بھرنے لگا۔ عجیب سوکھی سوکھی اکھڑی ہوئی سانسیں۔ میں سمجھی نہ جانے کمبخت کو سرسام ہو گیا، یا کیا۔ اور اسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

"بجّو جاؤ مت..... میں مرجاؤں گا"۔ اور بری طرح بچوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا اور اس کی آنکھیں! وہ جیسے..... نہ جانے آج مجھے ان آنکھوں میں کیا نظر آرہا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ شوخی سے تھرکنے کے بجائے چڑھی ہوئی اور گہری تھیں۔ کچھ پاگل سی! کچھ عجیب! مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم ہوا گویا اندھیرے پیچ دار راستوں میں پریشان چکر لگا رہی ہوں، اور کوئی دروازہ نہیں ___

کوئی قریب کے پلنگ پر کلبلایا۔ اور وہ جلدی سے چونک پڑا "جاؤ..... رابعہ جاگ گئی!" اس نے خوف زدہ ہو کر مجھے دور دھکیل دیا۔ "جاؤ جلدی"۔ وہ خود دوڑ کر چادر میں چھپ گیا۔

میں پریشان لیٹ گئی۔ یا اللہ! کیا واقعی یہ پاگل ہو رہا ہے! "رابعہ جاگ گئی!" تو کیا ہوا؟ مجھے چچی جان پر رحم آنے لگا۔ خدانخواستہ..... خیر.....

اور اس کے بعد اس میں ایک غیر معمولی انقلاب ہو گیا۔ وہی رات والی پاگل گہری

اور چڑھی ہوئی آنکھیں کبھی بغیر بخار اور ہذیان کے بھی کچھ عجیب ہو جاتیں۔ وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ چھیڑنے اور چڑھانے لگا۔ مجھ سے ہر وقت الجھتا اور پھر بالکل پاگل ہو جاتا۔ وہ میرے قریب میں رہنے کے بہانے تراشتا۔ ہر جگہ، ہر کمرے، ہر موڑ اور ہر کونے پر وہ میری تاک میں مجھے ڈرانے اور گدگدانے کے لئے چھپا رہتا۔ میں اس کی ضرورت سے زیادہ توجہ سے کبھی بے طرح پریشان ہو جاتی، اور کبھی مجھے وہ سب ایک الھڑ لڑکے کی شرارتیں معلوم ہوتیں۔ اور یہ شرارتیں کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں!

○

دو سال بعد جب میں رابعہ کی شادی پر آئی تو صلو کو صلاح الدین اعظم کہنا پڑا۔ اُفوہ ایک چھوٹا سا لچکتا ہوا کملایا سا پودا نوخیز درخت بن گیا تھا۔ خون کی حدت سے چہرہ سانولا ہو گیا تھا۔ اور پتلے سوکھے زرد ہاتھ سخت گٹھلیوں دار مضبوط شاخوں کی طرح جھلسے ہوئے بالوں سے ڈھک گئے تھے۔ اور آنکھیں توبہ خدا بالکل پاگل ہو گئی تھیں۔ پتلیاں ناچتی بھی تھیں اور ایک دم سے جم کر گہری ہو جاتیں کہ فوراً آنکھ جھپک جائے۔

"بجو کچھ میری مونچھوں کا رعب پڑتا ہے؟"

"خاک! اس قدر بُری شکل ہو گئی ہے۔"

"اور تمھاری بڑی بھولی ہے نا۔" اس نے مجھے گدگدانا چاہا۔ میں اس کے بڑے بڑے ہاتھ دیکھ کر ہی لرز گئی۔

"ہٹو صلو..... خدا کے لئے۔ تم سے ڈر لگتا ہے۔ ریچھ ہو گئے ہو بالکل۔"

"ہاں، اور وہ غرور سے اور پھیل گیا۔"

"ارے میں مار دوں گی صلو....." اس نے زبردستی اپنا کھردرا گال میرے ہاتھ پر زور سے رگڑ دیا۔ سارا ہاتھ جھلا اٹھا۔ جیسے لوہے کا برش۔ کبھی تو میں اکر پچھتاتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

شادی کا گھر اور وہ بھی ہندوستانی طریق۔ گھر کیا ہوتا ہے ایک بھول بھلیاں کا راستہ۔ جس میں مزے سے آنکھ مچولی کھیلو۔ سر کو پیر کی خبر نہیں رہتی۔ اور نہ جانے کتنے کھلاڑی آنکھ مچولیاں کھیل رہے ہوتے ہیں۔ کبھی دو چوروں کی کسی کونے میں ٹکر ہو جاتی ہے تو پھر جھینپ! مزہ آجاتا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے ہر کونے، ہر دیوار کی آڑ میں، ہر زینہ پر کئی کئی صلاح الدین کھڑے ہیں۔ آپ کدھر بھی چلی جائیے ناممکن جو صلاح الدین نہ موجود ہو جائے۔ بعض وقت تو یہ معلوم ہوتا گویا آسمان ہی سے ٹپک پڑے۔ میں عاجز آکر رابعہ کے پاس گھس گئی۔ لو وہ تھوڑی دیر میں لاڈلا بھیا بہن کی صورت دیکھنے کو موجود! اور پھر یہ کہ ہم دونوں رضائی میں بمشکل سما رہے ہیں کہ جناب اپنے بے ڈول ہاتھوں اور چوڑے کندھوں کے اسی رضائی میں گھسیں گے۔ کس سے شکایت کی جائے۔ کس کے آگے گلا کریں؟ یعنی ان جگر کے ٹکڑے کلیجے کی کور، کی کس سے شکایت کی جائے؟ اور کیا شکایت ہو۔ گھرک دو۔ سنجیدگی سے ڈانٹ دو۔ آپ ہی شرم آئے گی۔ مگر وہ سنجیدہ ہونے کا موقع بھی دے۔

"جاؤ چلو سر میں درد ہے"۔ جو یہ بہانہ کیا تو۔

"سر میں درد؟ ارے اماں جان بام کہاں ہے۔ ڈرائیور کو بھیجئے۔ ڈاکٹر سے اسپرو لائے، اور بھئی کوئی شور کرے گا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ چلو رشو، حمید، منی کھسکو یہاں سے بجو کے سر میں درد ہے"۔ دروازہ بند! یا اللہ! لیجئے سر کا درد غائب اور اماں جان سے ضروری کام نکل آیا۔

"کیوں بجو چھوٹی! کہہ رہی تھی سر میں درد ہے اور یہاں پوریاں تلی جا رہی ہیں"۔ لیجئے باورچی خانے میں بھی موجود۔ اب بھاگئے!

کبھی آنچ بگاڑ دی کبھی کچھ اور، پھر وہی شرارتیں! باورچی جانتا ہے کہ میاں بے چین ہو ٹی ہیں۔

"بی بی آپ بھی جائیے اور صلو میاں بھی۔ ورنہ مجھ سے کھانا پک چکا۔"
"صلو مجھے تم سے ایک بڑی ضروری بات کہنی ہے"۔ میں نے سوچا آج انھیں سنجیدگی سے ڈانٹوں۔
"کس سے ؟ مجھ سے ؟ ۔۔۔۔ ارے میرے بھاگ !" ایسے خوش گویا تمغہ ملنے والا ہے۔
اب ضروری بات کہنے سے پہلے خود اس قدر ضروری خدمات انجام دینا شروع کیں کہ بھاگتے ہی بن پڑے۔

○

کیا لوگ اندھے ہوتے ہیں ؟ دکھائی نہیں دیتا انھیں ؟ آنکھ مچولی میں تو بڑے بڑے شاہ پکڑے جاتے ہیں اور صلو جیسا چور ! دن دہاڑے ڈاکہ ڈالنے سے نہ چوکے لوگ سمجھتے ہیں بچہ ہے۔
سنیما میں لوگوں کو بس عورت ہی عورت دکھائی دیتی ہے خواہ ہزاروں مرد کام کر رہے ہوں، اور میں بھی عورت تھی۔ مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ چند ایسے غیر جانب دار بھی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت نہ کسی کے کلیجہ کا ٹکڑا دیکھیں نہ جگر کی ٹھنڈک، کھری دھار پڑتی ہے تلوار کی۔ مجھی کو تو الزام دے گی دنیا ! یہ تو کوئی دیکھتا نہیں کہ فتنہ ۔۔۔۔ غصہ سے آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔
"ہٹ جاؤ صلاح الدین۔ حد ہوتی ہے بیہودگی کی۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں"۔
"ایں"۔ اس کا منہ اتر گیا "کیا ہوا بجو"۔
"کچھ نہیں ۔۔۔۔ تمھیں معلوم ہے لوگ کیا کہتے ہیں"۔
"میرا بولنا ۔۔۔۔ میرا ۔۔۔۔ آپ کو برا لگتا ہے"۔
"ہاں مجھے بہت برا لگتا ہے۔ اچھی بات نہیں۔ لوگ ۔۔۔۔"

"لوگ ؟..... کون لوگ ؟ کون لوگ ہیں وہ مجھے بھی بتاؤ ذرا ——"

"کوئی بھی ہوں وہ۔ میری اور تمھاری بہتری چاہنے والے"۔

"بہتری"۔ وہ سرخ ہوگیا۔

"ہاں اسی میں بہتری ہے"۔ اور میں تیزی سے چلی آئی۔ دل پر سے بوجھ اتر گیا۔ آخر کو میں نے کہہ ہی دیا۔ عورت کے تو ہاتھ میں ہے خواہ وہ بدراہ ہو جائے خواہ عین موقع پر آنکھیں کھل جائیں اور اسے عاقبت نظر آنے لگے۔ آنکھیں کھل گئیں اور خوب موقع پر کھلیں میں دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔

صلاح الدین آیا۔ میں حسب عادت چوکنی ہوگئی۔ مگر گذرا چلا گیا۔ اس نے مجھے دیکھا تک نہیں! میرے دل پر گھونسہ سا لگا۔ خیر..... اونہہ..... کیا ہے۔ بہتری اسی میں ہے۔ بلا سی جان چھوٹی۔ کسی وقت سکون ہی نہ تھا۔ اب تو..... خیر! اور گھر کے ہر کونے اور ہر موڑ اب کوئی بھی نہ تھا؟ گویا امن، چین اور سکون! لیکن یہ پھر پریشانی کیسی؟ ایک فکر سی، ایک پستی، گویا کمان اتر گئی، دھار گٹھل ہوگئی۔ گویا کچھ ہے ہی نہیں۔ اب کوئی آپ کو دیکھ کر کھنچا نہیں چلا آتا۔ اب کسی کو شرارتیں نہیں سوجھتیں، اب کسی کی عجیب اور پاگل آنکھیں آپ کے پیچھے نہیں دوڑتیں۔ جائیے شوق سے جائیے۔ اندھیری کوٹھری میں بھی چلے جائیے۔ کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ چور ملتا بھی ہے تو آپ کو جھک کر آداب عرض کرتا ہے اور سر جھکا کر چل دیتا ہے ایک طرف کو۔ اب کوئی آپ کے پاس گھس کر بیٹھنے کا شوقین نہیں۔ بلکہ دور..... وہ سامنے کمسن خوبصورت لڑکیوں کے جھرمٹ میں شرارت بھری آنکھیں نچا کر خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ کبھی بھولے سے بھی اگر آنکھ مل جاتی ہے تو سر جھک جاتا ہے —— پہچانتا تک نہیں!

شادی کے گھر میں معلوم ہوتا ہے موت ہوگئی۔ ایک موت نہیں سینکڑوں موتیں۔ ہزاروں خیالات، سینکڑوں جذبات، اور ان گنت مسکراہٹیں مردہ پڑی ہیں۔ گھر بھائیں

بھائیں کر رہا ہے۔
اور چچی تو معلوم ہوتا ہے کبھی تھیں ہی نہیں کوئی اپنی۔ رابعہ اپنے دولہا کے خیال میں مست۔ حمیدہ کا بچہ ضروریات زندگی ہی سے فارغ نہیں ہو چکتا۔ جی چاہا بیچ شادی سے چل دوں کالج۔

دیکھنے والوں نے دیکھ لیا اور تاڑ بھی لیا۔

"اے یہ صلو کی اور تمھاری کیا ان بن ہو گئی ہے"۔ چچی بولیں۔

"نہیں تو"۔ میں جلدی سے بولی۔

"جھوٹ"۔ صلو نے دبی آواز میں کہا اور کھانے کی پلیٹ پر جھک گیا۔

"اوئی! چھوٹوں سے کیا غصہ۔ چلو صلو باجی سے معافی مانگو"۔

"جی نہیں . . . . . یہ خود مانگیں معافی"۔ صلو اکڑے۔

"معافی وافی کیسی؟ کوئی لڑائی نہیں ہوئی"۔ میں نے معاملہ کو سیدھا کرنا چاہا۔

"جی نہیں میری تو ہے لڑائی"۔

"یہ کیوں۔ آخر ہوا کیا؟"

"ہوا یہ کہ . . . . . خواہ مخواہ ڈانٹنے لگیں . . . . ."

"کچھ بھی نہیں چچی جان یہ مجھے چھیڑ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا مجھ سے مت بولو۔ بھلا میں اس سے لڑوں گی"۔ میں جلدی سے بولی۔

"نہیں اماں جان . . . . . کیسی بھولی بن رہی ہیں۔ ایسے انھوں نے نہیں کہا تھا . . . . ." اور میں ڈری کہ کہیں اس نے کہہ دیا سب کے سامنے تو کیا ہوگا۔ مجھے خیال ہوا کہ میری غلط فہمی ہو گی۔ شاید یہ بھی اس کی شرارتیں ہیں اور . . . اور شاید یہ شرارتیں ہی ہوں، لعنت ہے کہ میں اسے اس قدر ذلیل سمجھی!

"مجھے ایسی بری طرح کہنے لگیں . . . . . ہنہ، جیسے میں کوئی وہ ہوں . . . . ."

"ارے میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ لیجئے ملاپ ہوگیا! اب ؟"

"لو اسی بات پر ہاتھ ملاؤ۔ اوہ۔۔۔۔ کس قدر سردی ہے۔ ساری رضائی آپ اوڑھے بیٹھی ہو۔ یہ نہیں کہ کسی اور کو بھی اڑھا لو۔"

وہ رضائی میں گھس کر بیٹھ گیا اور میرے اتنی چٹکیاں لیں کہ ملاپ کرنے کا مزہ آگیا۔

"صلو خدا کا واسطہ۔ پھر کہو گے میں نے یہ کہا اور وہ کہا" چچی جان معصومیت سے مسکرا رہی تھیں۔

"کہا ہی کیسے تم نے۔ بولو ہاریں کہ نہیں۔"

"بابا میں تجھ سے جیتی اور نہ جیتنے کا شوق۔ بس"۔ وہ ہنسا، دنیا کی ہر چیز ہنس پڑی"۔

اور پھر وہی آنکھ مچولی! وہی بھول بھلیاں! اور عاقبت! ایک دفعہ کو عاقبت بھی کھلکھلا پڑی۔ کونا کونا مسحور کن نغموں سے گونج اٹھا۔ کان گنگ ہوگئے، اور آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ میٹھی میٹھی کٹھک والی ریت!۔

اور اب قصور کس کا ؟ قصور تو ہونا ہی ہوا کسی کا۔ تقدیر کا ؟ بچاری تقدیر! بات یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ یہ کہنے کے لئے کہ۔۔۔ وہ تاکہ دیکھے ۔۔۔ یہی کہ بس دیکھے! جیسے کہ ہم تماشہ دیکھتے ہیں! اور۔۔۔۔ دھڑ گا۔ بدنامی، ذلت، پریشانی، بربادی، تباہی اور۔۔۔ اور سب کچھ ایسے ہی موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ کچی شاخ میں جھولا ڈالو تو آپ ہی چرچرائے گی۔ بھئی خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہیئے کہ گدا کمزور تو نہیں۔ رسی تو گھنی گھنائی نہیں۔ ورنہ آپ ہی ٹخنی ٹلکے گی۔

○

لڑائی پر جانے سے چند دن پہلے تشریف لائے۔ ننھا برآمدے میں "لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ" کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسے سٹپٹائے کہ بس۔

"لمبی چوڑی ہے مری فوج !" میں نے سوچا "بڑے بڑے دہل جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔"

"تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"کیا ..... ؟"

"یہ ..... یہ ....." وہ ننھے کو گھورنے لگے۔

"اوہ یہ ..... ہاں کوئی ایسی بتانے کی بات ہی کیا تھی۔ میں نے اسے یتیم خانہ سے لے لیا تھا۔ جی بہلتا ہے اس سے۔"

"مگر یہ ..... سچ بتاؤ" کتنی گھبراہٹ اور کتنی التجا تھی۔

"کیا بتاؤں ؟ ..... ہاں تم اپنی کہو، یہ چچی جان نے لاڈلے بیٹے کو کیسے لڑائی پر بھیج دیا ؟" میں نے بات پلٹی۔

"لڑائی پر ..... وہ ..... ہوگا ..... تم پہلے یہ بتاؤ ..... کہ ..... وہ ننھے کی طرف مڑے۔

"سمجھ ہی میں نہیں آتا تمھاری تو ..... کہا تو یتیم خانہ ....."

"ہوں ....." صلو کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ کچھ کھوئی ہوئی سی کھسیانی صورت

"جی گھبرا رہا ہے ؟" میں نے چھیڑا۔

اور ان کی رنگت بدلی —— "بچارا بچہ ! مر گیا اس کا باپ شاید !" تلخی سے کہا گیا۔

"خاک تمھارے منہ میں۔ خدا نہ کرے" میں نے ننھے کو کلیجے سے لگا لیا۔

"ٹھائیں ....." ننھے نے موقع پا کر بندوق چلائی۔

"ہائیں ..... پاجی ..... ابا کو مارتا ہے" میں نے بندوق چھین لی۔

اور پھر آنکھوں میں وہی شرارت تڑپی ..... پھر ..... بلا کی گہری ہو گئیں .....

کیسا پاگل ! ..... عجیب سا ! ..... ٹٹولنے کے باوجود اس بھول بھلیاں میں راستہ نہ ملا۔

پنکچر

"پنکچر!"

اوہ، بس دم ہی تو نکل گیا۔ کمبخت دو آنے گھنٹہ لیتے ہیں اور ایسی گھنی گھنائی سائیکل پکڑا دیتے ہیں۔ کتنی دفعہ ابا میاں کو لکھا کہ ہمیں ایک سائیکل دلا دیجئے، تھٹی ہو۔ کالج کا کام ویسے نہیں چلتا۔ کون پیل پھر گھسٹ گھسٹ کر ورنہ جائے اور پھر اس دھوپ میں؟ توبہ کیجئے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ سب بناوٹ ہے، کوئی ضرورت سائیکل کی نہیں، لڑکیوں کو تو اترانے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ سائیکل ویسے بھی کوئی سواری نہیں، نٹوں کا کھیل ہے، پالکیاں نالکیاں ڈولیاں سب اڑ گئیں۔ پہلے تو اچھے اچھے داڑھی والے تک پالکیوں میں سوار ہوا کرتے تھے۔

اور اب؟ یہ "اب" ملعون نہ جانے کیوں پیدا ہو گیا۔ خدا میں سب کچھ طاقت ہے۔ وہ چاہتا تو یہ "اب" دنیا میں آتا ہی نہیں۔ وہی سہانا "جب" رہتا اور پھر خدا کو اس "اب" کے ساتھ عورت کیوں پیدا کرنی تھی۔ کیا بنا عورت کے دنیا نہ چلتی؟ ہاں ذرا بچوں کا سوال ٹیڑھا سا تھا، سو وہ بھی کیا تھا، مردوں ہی کی پسلیوں سے کھٹا کھٹ بچے پیدا ہوتے اور کچھ کھا پی کر پلی ہی بجایا کرتے۔ کیسا سکون ہوتا۔ شانتی ہی شانتی! مگر اب تو پنکچر ہو چکا تھا۔!

"لعنت ہے۔" میں نے ٹائر کو لاچاری سے ٹٹول کر سوچا۔ اور اڈے نا کے انتظار میں مٹت

پرا کرتی ہوں۔ بیٹھ کر سوکھے تنکوں سے زمین پر پھول کاڑھنے لگی۔ یہ ایڈنا ہی کی رائے تھی کہ آج دور کی سیر رہے۔ بھلا شہر سے چار میل مرنے کی مجھے کیا ضرورت آن پڑی تھی۔ سوچا لاؤ ذرا پہیہ کو دیکھوں۔ مگر خاک جو عقل نے کام کیا ہو۔ کالجوں اور اسکولوں میں سینا پرونا اور کھانا پکانا تو سکھایا جاتا ہے مگر یہ نہیں کہ ذرا پنکچر جوڑنا بھی سکھادیا جائے۔ کہو بھلا پڑھ لکھ کر ہم کھانے پکاتے ہی کو تو بیٹھے رہیں گے! چٹورپن عورت کی خصلت میں ہے ہی نہیں اور خدا کسی کو ایسا میاں نہ دے، جو ہر وقت زبان کی چاٹ میں مبتلا رہے۔ جو بھوسی چوتی سامنے رکھ دی صبر شکر سے کھالی۔ اور پھر یہ سائیکلیں کون جوڑے گا؟ لیجیے جو ذرا پہیہ کھولنے کی کوشش کی تو انگلی الگ پچی اور سارے ہاتھ سڑ گئے بدبو سے۔

ٹنن ٹنن۔ سائیکل کی گھنٹی بجی۔ میں سمجھ گئی، ایڈنا آگئی۔ اور اب مجھے جلائے گی۔ مگر میں نے بھی ارادہ کرلیا کہ لڑ ہی تو پڑوں گی۔

"ہوں۔ پنکچر؟" کوئی بولا ——— واضح رہے کہ بولا۔ بولی نہیں ——— کوئی راہ گیر تھا۔ گو میں قطعی رومانس (ROMANCE) کے موڈ (MOOD) میں نہ تھی، چونک پڑی۔

"یہ ——— جی ہاں ——— پنکچر ہوگیا شاید"۔ میں نے معصومیت سے کہا۔

"واقعی!"۔ وہ بے ہنگم سا لمبا انسان مذاق اڑانے کے لہجہ میں بولا۔

"جی ہاں! کوئی کانٹا چبھ گیا شاید"۔ میں نے معصومیت کی دال نہ گلتے دیکھ کر اونچی اور کھری آواز سے کہا۔

"واقعی"۔ پھر وہی کمینہ تمسخرانہ گفتگو۔ کاش کوئی اسے خواتین سے گفتگو کرنے کا سلیقہ سکھاتا۔

"ہیں؟ ——— یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ گویا پنکچر نہیں اور میں . . . ."

"جی ہاں ——— پہیہ بڑی آسانی سے کھول کر ہوا نکالی جاسکتی ہے"۔

"مگر یہ کیوں؟"

"یہ ـــ یہ ـــ ذرا یونہی ـــ ذرا ـــ" لمبے آدمی کا لمبوترا چہرہ مکارانہ طریقہ پر مسکرایا۔ واضح رہے کہ صورت سے کوئی شبہ نہ ہوتا تھا۔ خاصا شریف انسان معلوم ہوتا تھا۔

"اس سے آپ کا مطلب؟"

"یہی کہ شوق ـــ آپ لوگوں کو ذرا شوق ہوتا ہے کہ جہاں کوئی رومنٹک جگہ دیکھ لی، اور کوئی حادثہ لے بیٹھیں ـــ پنکچر ہو رہے ہیں۔ دریا میں ڈوبی جا رہی ہیں، بدمعاش لئے جاتے ہیں۔ جہاں دیکھو ـــ"

"آپ یقیناً بہک رہے ہیں" میں نے جل کر کہا۔ نہ جانے کیوں یہ طعنے میرے دل میں چبھ گئے۔

"جی ـــ بہک ہی تو رہا ہوں۔ یہی تو مصیبت ہے، ابھی کل ہی تو کتاب میں لکھا دیکھا کہ ایک حسین لڑکی۔ میرا مطلب ہے دوشیزہ کی موٹر راستہ میں بگڑ گئی، اور ادھر سے ـــ آپ بتایئے کون آیا؟" وہ یہ کہہ کر کر یہہ ہنسی ہنسا۔

میں اور بھی جل گئی۔ "کون جانور ـــ شیر یا بھیڑیا ـــ" میں نے بن کر کہا۔

"آپ بنئے مت ـــ وہی پریوں کا شہزادہ۔"

"ہوں تو پھر مجھے کیا اس سے؟" میں نے سوچا۔ اب یہ آیا ہے تو یا تو سیدھی طرح ایک مصیبت زدہ خاتون کی مدد کرے، جو اس کا اخلاقی فرض تھا، ورنہ غارت ہو یہاں سے۔

"مگر پھر کیا ہوا؟ یہ معلوم ہے آپ کو؟" وہ اور بھی بے تکلفی سے بولا۔ اور بڑے انداز سے سر ایک طرف کو کر لیا۔

"آپ عجیب انسان ہیں؟" میں نے واقعی تعجب سے کہا۔

"اوہ اب آپ رومنٹک تو بنئے مت!" اس نے رکھائی سے میری سائیکل ٹٹولی۔

"اصل بات یہ ہے، میں سمجھا ـــــ خیر جاتے دیکھئے ـــــ آپ لوگوں کو عموماً یہ عادت ہوتی ہے کہ جہاں رومانس (ROMANCE) کی تلاش ہوئی ـــــ اور ـــــ"

میں حیرت سے اس انسان نما جانور کو دیکھنے لگی۔

"اگر آپ ایمانداری سے کہہ دیں ـــــ دیکھئے دیکھئے۔ آپ تیور دکھائیں گی تو یاد رہے کہ ـــــ ہاں سنا آپ نے۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں، سمجھیں صاحب! اگر واقعی آپ کی سائیکل بگڑ گئی ہے۔ تو از راہ نوازش میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں"۔ اس نے کوٹ اتار کر آستینیں چڑھائیں۔

میں نے ساری عمر ایسا انسان نہیں دیکھا تھا۔ جس نے میرا کام کرنے سے انکار کیا ہو۔ لڑکے خواہ مخواہ بہ غرض احتیاط ہماری سائیکلوں میں ہوا بھر دیتے۔ اگر یونی ورسٹی گیلری میں اندھیرا ہوتا تو ہر لڑکے کی خواہش ہوتی کہ پہلے سے پہلے جاکر روشنی جلانے کی سعادت حاصل کرے۔ اگر ایسا کبھی اتفاق ہوتا کہ کوئی نظر نہ آتا تو ہم بالکل لاچار گھبرائے ہوئے اندھیرے میں متوجہ کن آوازیں نکالا کرتے اور سوئچ کی تلاش میں بڑا غل پڑتا۔ یہاں تک کہ کوئی اللہ کا شیر آکر ہمیں اس مصیبت سے چھڑاتا۔ یہ لڑکے کالج بھر میں شریف گنے جاتے تھے۔

مگر یہ بے ڈول انسان کچھ عجیب کوڑھ مغز تھا۔

"یوں کام نہیں بنے گا"۔ اس نے ادھر ادھر سے سائیکل کو دیکھ کر کہا۔ "اسے سامنے رہٹ پر لے چلئے۔ وہاں پانی میں پنکچر مل جائے گا"۔

اور بے توجہی سے اپنے کوٹ اور سائیکل کو اٹھا کر رہٹ کی طرف چلا.... میں نے دل میں سخت برا مانتے ہوئے اپنی سائیکل گھسیٹی۔ مگر کنوئیں پر پانی نام کو نہ تھا۔

"پانی تو ہے نہیں"۔

"پھر!"۔ میں نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

"پھر!" وہ مسکرایا۔ اور میں ڈری کہ کمبخت پھر مجھے شرمندہ کرنے کی فکر میں ہے۔

"ذرا یہ پہیہ گھمائیے، پانی ہی پانی ہے۔ میں نالی بند کرتا ہوں"۔ اور وہ موری سے کھیلنے لگا۔ آسان کام خود کر کے مجھے رہٹ پر جتا دینا کہاں کی انسانیت تھی؟ اور پھر سگریٹ جلا کر خوب ہوا میں دھواں پھیلانا شروع کر دیا۔

اس نے پانی میں ٹیوب ڈال کر پنکچر تلاش کرنا شروع کیا۔ میں لاچار غریب صورت بنائے اس کے پاس بیٹھی رہی۔ اس کا کوٹ جو زمین پر پڑا تھا، میں نے اس کی عزت افزائی کے لئے اپنے گھٹنے پر ڈال لیا کہ شاید اس کا غصہ کم ہو۔ اور اس سے زیادہ ایک انسان کی کیا عزت افزائی ہو سکتی ہے۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس نے مجھے غضب ناک آنکھوں سے دیکھا اور غرایا۔

"ہوں —— لاحول ولاقوۃ! یہ آپ نے پھر مجھے الو بنانا شروع کیا"۔ اس نے ٹیوب پھینک دیا۔ "واہ آپ مزے سے بیٹھی ہیں۔ خود کیوں نہیں بناتیں"۔ وہ دور کھڑا ہو گیا۔

میں ڈر کے اچک پڑی۔ جلدی سے کوٹ دور پھینکا اور بڑبڑاتے ہوئے خود پنکچر ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ خود دھواں اڑا اڑا کر منڈیر پر بیٹھا دیکھتا رہا۔

جب کوئی نیا اور جنگلی سا انسان آپ کی ہر مناسب بات کو بھی خواہ مخواہ اعتراض سے دیکھے جائے تو نہ جانے کیوں جی سا گھبرانے لگتا ہے۔ اوپر سے بولا "یہ آپ اترا اترا کر پنکچر چھوڑ کیوں دیتی ہیں —— ابھی ابھی آپ کا ہاتھ وہاں پڑا تھا"۔

"نہیں تو۔ کہاں"۔

"افوہ! کس قدر بنتی ہیں"۔

بنا و نا مناسب رخصت، مجھے پھر غصہ آیا۔ "آپ کو کیا۔ جائیں نا یہاں سے"۔

"اوہو! یہ لیجئے —— آپ نہ جانے کیا سمجھی ہوں گی —— لاحول ولاقوۃ ——"

اور وہ چلا۔

"مگر سنیئے تو" اس نے مڑ کر کہا۔ "سلیوشن اور پمپ تو آپ کے پاس ہو گا ہی۔ بھلا جب آپ کے پاس سب کچھ سامان تھا تو وہاں کیوں سایسر کر بیٹھ گئی تھیں۔ آپ لوگوں کو خدمت لینے کا تو بس چسکہ پڑ گیا ہے۔"

"آپ بہت بیہودہ انسان ہیں۔ میرے پاس نہ پمپ نہ سلیوشن۔" میں نے کھسیا کر چلانا شروع کیا۔

"اچھا یہ بات ہے —— ہوں —— تو پھر کہیئے ہوا کیا منہ سے بھریں گی ؟" اس نے ایک قہقہہ بھیڑیئے کی طرح منہ پیچھے پھینک کر لگایا۔

"آپ کی بلا سے۔" میں نے پنکچر منحوس سل کر کہا۔

"پھر —— پھر وہی رومنٹک بننا ہے۔" نہ جانے اس شخص کو رومانس سے کیوں جلن تھی ——

"آپ کس قدر —— وحشی —— ہیں۔" میں نے ٹیوب دور پھینک کر کہا۔ اگر آپ کا کوئی کام ہوتا تو مجھے مدد دینے میں کبھی بھی —— اس قدر کبھی —— کبھی —— میں اتنی بدتمیزی نہ کرتی ......"

"دیکھو جی۔ ہم نہ تو وحشی اور نہ جنگی۔ اور ہم کام سو دفعہ کریں۔ مگر جو تم اینٹھ کر ہمارے اوپر دھونس جماؤ تو —— واضح رہے کہ ——"

"مگر آپ بدتمیزی کیوں کرتے ہیں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"تم بھی تو بدتمیزی کر رہی ہو۔ دیکھو نا اب جو تمہاری جگہ کوئی لڑکا ہوتا، خدا کی قسم جوتے مارتا اس کے اور دوسرے پہیہ میں بھی پنکچر کر دیتا۔ انتہا ہے گدھے پن کی کہ نہیں نہ سلیوشن نہ پمپ، اور جنگل کی سیر کو جا رہی ہیں۔ جانتی ہیں، کوئی مل ہی جائے گا۔ جو پنکچر جوڑ دے گا۔ اور ہوا بھر کر، آپ کو سائیکل پر لاد کر پہنچائے گا گھر۔"

اُفوہ۔ میرا دل چاہا زور زور سے ہنگو اڑیں مار مار کر روؤں۔ یا کنواریوں کی طرح موٹی

موٹی گالیاں دے کر اس کے منہ پر ڈھیر کیچڑ کھینچ ماروں جو میرے پیروں میں بے طرح لتھڑ گئی تھی۔ مگر پھر شرافت آڑے آگئی۔ اور میں نے زور سے دانت بھینچ لئے۔ نہ جانے اب بھی اس کی کون سی کل سیدھی رہ گئی اور اس نے دور ہی سے سلیوشن ٹیوب پھینک دیا۔ بدتمیز انسان نے ہوا بھی نہ بھری، بیٹھا دیکھتا رہا۔ کس قدر دردناک سماں تھا۔ ہوا میں نے خود بھری۔

"آپ کا نام کیا ہے۔ آپ یہ سلیوشن اور پمپ لے جا سکتی ہیں۔ پتہ دے جائیے اپنا۔"

"مجھے نہیں چاہئے آپ کا سلیوشن۔" میں نے سائیکل کو کوستے ہوئے اٹھا لیا۔

"ادھر پھر نہیں۔"

سامنے سے ایڈنا آتی دکھائی دی۔

"آپ کی سائیکل میں پنکچر نہیں ہوا؟" اس نے بناوٹی استعجاب سے بغیر کسی تعارف کے ایڈنا سے پوچھا۔

"نہیں تو۔" ایڈنا تیوریاں چڑھا کر بولی۔ میں خوش ہوئی اب یہ جنگلی اس کی بھی خبر لے گا۔

"تعجب۔" وہ بولا۔

"کیوں؟" ایڈنا اکڑی۔

"ان کی سائیکل میں تو ہو گیا۔" اس نے طنز سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"جھوٹ، بالکل تو نئے ٹائر ہیں۔" ایڈنا بولی۔

"جی ہاں ــــ نئے ٹائروں میں تو اور بھی جلدی ہوتا ہے۔" اور وہ قہقہہ لگاتا چلا گیا۔

"سلی۔" ایڈنا جل کر بولی۔

میں نے اسے اس جنگلی کی ایک بات بھی نہ بتائی۔ اس قابل ہی کب تھی کوئی بات؟ اور وہ باتیں ہی اور ہوتی ہیں جنھیں ہم سر جوڑ کر ایک دوسرے کو بتایا کرتے ہیں۔

یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لٹھ نما حیوان یونیورسٹی میں ریسرچ کے لئے اسی سال آیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے!

"ہلو ٹیچر"۔ وہ کئی دفعہ ملا اور بے تکلفی سے بولا۔ اور پھر ہم اور زیادہ ملنے لگے۔ بہت جلد ہم بے تکلف ہو گئے۔ وہ اکثر آیا کرتا۔ مجھے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ بے لوث کھرا پن، چاپلوسی سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ گو وہ عموماً میری بات کاٹ دیا کرتا تھا۔ لیکن ہم پھر بھی ملتے تھے۔ ایڈنا اس کی صورت سے جلتی تھی اور کہتی تھی کہ "اس جنگلی کو تو اتوار کا ستیاناس کرنے کو تو کم از کم مت بلایا کرو"۔

میری اس کی ایک گھڑی نہ بنتی تھی۔ جہاں کسی شاعر یا مصنف کی تعریف میرے منہ سے نکلی، اور وہ بولا "اجی ہٹاؤ کمبخت کو، میرا بس چلے تو جلوا دوں اسے"۔

جہاں کہیں میں نے کسی تقریر کی تعریف کی اور اس نے بکنا شروع کیا "لاحول ولا قوۃ کس قدر ذلیل ٹرٹر تھی۔ کچھ تھا بھی اس میں۔ میں تو چپ رہا۔ ورنہ ـــــ وہ تو کہو خیر ہوئی"۔

میں ان باتوں سے اس قدر جل جاتی کہ اسے دلائل سے قائل کرنے کی برداشت نہ رہتی۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ میں اس سے ملتی ہی کیوں ہوں۔ مجھے کسی کی حکومت سہنے کی عادت نہ ہے نہ کبھی ہو۔

ایک دن تو بدتمیزی کی انتہا ہو گئی۔ اور ایڈنا نے کہا "پارٹی کے دام غارت ہوئے"۔ ہم نے پروفیسروں اور چند نامی لڑکوں کو دعوت دی۔ آپ بھی آئے۔ بولے۔ "تم بھی تو مضمون لکھتی ہو نا"۔

میں نے کتنی ہی دفعہ کہا، بھئی سب کے سامنے تم مجھ سے نہ بولا کرو۔ مگر اس نے ایسی بری بری دھمکیاں دیں کہ مجبوراً سہہ گئی۔

"ہاں۔ لکھتی ہوں"۔ میں نے ذرا تکلف سے کہا۔

"کیسے لکھ لیتی ہو مضمون نا"۔ اس نے حیرت سے کہا۔

میں چونکی۔ مگر سنجیدہ دیکھ کر کوئی شاعرانہ طریقہ سوچنے لگی۔
بولے۔"خیالات دل میں آتے ہوں گے"۔
میں نے سر ہلا دیا۔
"وحی سی آتی ہو گی؟"
"ہاں۔ وحی آتی ہے"۔ میں نے انسانیت کے جامہ میں دیکھ کر مسکرا کر کہا۔
"کیسے آتی ہے وحی تم جیسوں کو۔ جیسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے ویسے ہی؟ پہلے کچھ سردی سی لگتی ہو گی؟" وہ پھر اڑنے لگا مجھ سے۔
"خیالات ہوتے ہیں، وہ دماغ میں آجاتے ہیں"۔ ایک اور صاحب بولے۔ انھیں شاید مجھ پر رحم آیا۔
"نہیں جی۔ خیالات وغیرہ کچھ نہیں۔ ہمیں نہ آجائیں خیالات؟ یہ تو کوئی اور بات ہے"۔ مکاری سے مسکرایا۔
"کوئی اور بات کیا ہو سکتی ہے"۔ ایک پروفیسر نے کہا۔
"یہی کوئی ——— اب تو یہ ڈاکٹر سے پوچھا جائے۔ وہ ہنسی چھپانے کو آگے جھک گیا۔
میں اور سارے سننے والے سکتے میں رہ گئے۔ کچھ بدتمیز لوگ ہنس بھی پڑے۔
سب کے جانے کے بعد میں نے لڑنے کی بے انتہا کوشش کی۔ مگر ناکام رہی۔
وہ بضد اس بات پر اڑا رہا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ خیر اس میں ہے کہ بجائے فخر کرنے کے فکر کی جائے۔ آثار کچھ اچھے نہیں اور الٹی میں نیم پاگل تو ہو ہی چکی ہوں۔

○

وہ عموماً مجھے "بنجر" کہا کرتا۔ میں نے بغاوت پر آمادگی ظاہر کی تو مجھے سب کے سامنے بنجر کہنے پر تل گیا۔ کہا میں نے، کہ اس سے تو بحث کرنا بے کار تھا۔ میں بچوں کی طرح چڑ

جاتی اور بات اس سے کی جائے جو انسانیت کے جامے میں ہو۔ خواہ مخواہ کے اعتراضوں سے نہیں ڈرتی۔ پر نہ جانے کیا بات تھی۔ جب وہ کسی بات پر اعتراض کرتا، میرے دل کو جا لگتی اور غیر ارادی طور پر وہ بات ہی پھر مجھ سے نہ کی جاتی۔

○

دہرانے سے کیا فائدہ۔ بس ہم برابر ملتے رہے، آپ تعجب کریں گے کہ کیوں میں نے اس جنگلی سے راہ و رسم جاری رکھی۔ تو یہ خود نہیں معلوم۔ کمزوری سمجھ لیجئے۔ یا جو جی چاہے آپ کا۔ نہ جانے اس میں کیا بات تھی کہ کھینچے لیتی تھی۔ وہی باتیں جو پہلے بد تمیزی کی معلوم ہوتی تھیں اب بھلی معلوم ہونے لگی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اوپری دل سے اسے وحشی اور جنگلی کہنے کے باوجود اگر وہ کسی دن نہ آتا۔ اور ایک آدھ جھگڑے کا لطف پیدا نہ ہوتا، تو جی نہ لگتا۔ میرا دل خوف سے بیٹھ جاتا۔ جب مجھے محسوس ہوتا کہ اس کے بغیر زندگی سونی ہوگی۔ اس کے دل کا حال مجھ سے پوشیدہ تو نہ تھا نتیجہ وہی ہوا جو دو انسانوں کے ملنے سے ہوتا ہے پر وہ انسان ہوتا جب نا! اس کی تو کوئی بات ہی ڈھنگ کی نہ تھی۔ اس کے اظہار الفت کا طریقہ بالکل حضرت آدم کا سا تھا۔

○

وہ جنگلات میں ایک معمولی عہدے پر مقرر ہو گیا اور اب بجائے روزانہ کے ہفتہ اور اتوار کو ملنا ہوتا۔ اس نے بارہا وہاں کی تنہائی کا ذکر کیا۔ مگر جونہی میں نے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہا، تنہائی، سکون اور اطمینان کی زندگی کہہ کر الٹی تعریف کرنی شروع کر دی مجھے اب بھی انتظار تھا۔ نہ جانے کس بات کا۔ ایک دن فرمانے لگے "تم ہوتیں تو یقیناً پسند کرتیں تیرنے کے لئے بہترین مقام ہے"۔ اور اس سے آگے کچھ بھی نہیں۔

میں خاموش رہی۔ کئی دفعہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس سے قبل کہ میں خود ہی موقع دوں وہ کسی معمولی سی بات پر اس بری طرح اعتراض کرتا کہ میں

جل کر دل میں تو یہ کرتی۔ کہ خدا ہی بچائے اس بلا سے۔ مگر ہم عورتوں کی کوئی بات سیاسیات سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر ہم کسی بات کو کرنا چاہیں تو سیدھے راستے کبھی نہیں چلتے۔ بلکہ گھوم گھوم کر منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کامیابیاں زیادہ تر عورتوں ہی کو نصیب ہوتی ہیں، گو کوئی مانتا نہیں اس بات کو۔

فرض کیجئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا چھوٹا سا بھائی ذرا تخت کے نیچے گھس کر اگالدان نکال لائے۔ پر وہ ہے کہ شیشے کی گولیوں یا اور کسی غیر دلچسپ کھیل میں منہمک ہے، آپ گھرکتے ہیں۔ تو وہ رونے کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسے موقع پر آپ کیا کریں گے۔ ہم تو یہ کرتے ہیں کہ فوراً کسی دوسرے بچے کو پکارتے ہیں جو گھر میں موجود نہ ہو۔

"بھائی مکھن، میاں ذرا اگالدان تو اٹھا لاؤ ـــــ وہ ـــــ وہ دیکھو تخت کے نیچے سے اس کا کنارہ چمک رہا ہے۔ شاباش۔ آہا دیکھیں آنکھیں میچیں کون لائے ـــــ کون لائے"۔ اور وہ معصوم رقابت کی جنون میں تیر کی طرح دوڑتا ہے۔ اگالدان آجاتا ہے ہے نا؟ تو میں نے بھی منظور صاحب کو الہ کار بنایا۔ بڑی شرم کی بات ہے، پر آپ ہی بتائیے اور کیا کرتی؟

اگر میں اس سے بے حیائی لاد کر کہہ دیتی۔ "آؤ ہم تم شادی ہی کر لیں نا، بے کار تم وہاں تنہا اور میں یہاں"۔ تو یقیناً وہ بھڑک اٹھتا۔ مجھے معلوم تھا وہ مر جائے مگر منہ سے تو کبھی کچھ نہ کہے گا۔ اس سلسلہ میں خدا معاف کرے منظور کی نئی موٹر میں بڑی بڑی سیریں کیں۔ اور یہ دستور ہو گیا کہ میرا وحشی دوست تو چھٹی لے کر آئے اور میں ٹال دوں۔

"معاف کرنا منظور نے آج پکچر جانے کا وعدہ کیا ہے۔ بہت عمدہ پکچر ہے"۔ اور وہ اپنا سا منہ لے کر چلا جاتا۔ میرا دل کٹ جاتا اور پکچر دھندلی دکھائی دیتی۔ منظور، خدا کرے اسے بہت اچھی بیوی ملے۔ اس غیر معمولی عنایت سے ذرا بھی حیران نہ تھا۔ نئی نوکری نے شادی کے بازار میں ان کی چوگنی قیمت کر دی تھی۔

مگر اللہ رے جنگلی پن۔ رقابت اپنا کام کئے بغیر نہ رہتی اور وہ تلملا اٹھتا۔ بل کھاتا۔ مگر کیا مجال جو ٹس سے مس ہو جائے۔ اور ہی علاج کیا۔ یعنی آنا ہی چھوڑ دیا۔ اور مجھے پھر وہی اندھیری شکست کے ہولناک خیالات نے گھیر لیا۔ شکست اور زندگی کے اس خاص شعبے میں ؟ یہ سمجھئے زندگی کے دائرے میں۔ پنکچر۔ شکست کا بدلا جل کر مکمل شکست کھا لینا ہی ہم لوگوں کے بس کی بات ہوتی ہے۔ نہ جانے انتقاماً یا خود کو سزا دینے کے لئے۔ میں نے منظور کی انگوٹھی پہن لی۔ ذرا ڈھیلی تھی اور گر گر پڑتی تھی۔ پر میں نے آگے ایک تنگ چھلا پہن کر اسے روکے ہی رکھا۔

O

میں نے اپنے اوپر ایک قسم کی ڈھٹائی سی لاد لی تھی۔ جلدی جلدی تیاریاں کرنا شروع کیں۔ ارادہ ہوا کہ فوراً ہی کشمیر چل دیں گے۔ منظور کی غیر موجودگی میں مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی۔ دل بغاوت پر تل جاتا اور یہ محسوس ہوتا کہ اگر فوراً شادی نہ ہو گئی تو ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے خود پر ذرا بھی بھروسہ نہ رہا تھا۔ بعض وقت تو ان باغیانہ خیالات پر خود کو سزا دینے کے لئے منظور پر ضرورت سے زیادہ عنایات کی بارش کی جاتی، پر کون جانے وہ سارا اظہار اور لگاوٹ دل میں کس کا خیال لے کر کیا جاتا ؟ خدا ستار عیوب ہے۔ منظور کو کیا معلوم کہ اس کی حیثیت ایک ڈمی کی سی تھی۔ جب کہ دل کہیں اور ہوتا تھا۔ نہ جانے ہندوستان میں کتنی عورتیں اپنے شوہر کے گلے میں باہیں ڈالتے وقت کس کے خیال میں کھوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں سچی محبت بھلائے نہیں بھولتی۔ زخم بھر جاتا ہے پر جہاں پوربیہ ہوا چلی اور ٹیسیں اٹھنا شروع ہوئیں۔ پر آج کل تعجب ہے مصنوعی ناک کان مل جاتے ہیں تو سکون قلب کیوں نہیں مل سکتا ؟ یہ ناممکن ہے ضرور ملتا ہے۔ تلاش کرنے والا چاہئے۔

O

شام کے وقت درزی کو رخصت کر کے اندھیرے ہی میں خاموش ایک کرسی پر لیٹی رہی۔ کس قدر اداسی سی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ہوا میں ہزاروں زہریلی گیسیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کلیجہ میں عجب قسم کی سوزش ہو رہی تھی۔ کہ اگر بہت ضبط کیا تو سینے میں کوئی چیز زور سے پھٹ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ منظور! میرا خیال ان کی طرف گیا! انھیں میں گیس ماسک کی طرح استعمال کر کے ہمیشہ ان گیسوں سے بچ جایا کرتی تھی۔

برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ منظور کے آنے پر مجھے ہمیشہ بن کر چونکنا پڑتا تھا۔ اور اس وقت تو میں نیم مردہ ہو رہی تھی۔ ایک لمبا چوڑا سایہ کمرہ کے دروازے پر نظر پڑا۔ وہ کچھ آشنا سی بالوں کی تراش خاص جھکاؤ لئے شانے اور باہر کی دھندلی روشنی میں پتھر کی ترشی ہوئی مورتی کا سا کرخت چہرہ! دل تڑپ تڑپ کر اچھلنے لگا۔ اگر مجھے پورا یقین نہ ہوتا کہ یہ ظالم مجھے خون تھکوا دے گا، تو چیخیں مار کر اس بے رحم سے چمٹ جاتی۔ تین ہفتوں بعد آج مرنے کی فرصت ملی تھی۔ مگر منظور کی متبرک انگوٹھی گیلری کی دھندلی روشنی میں جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

"ارے اس قدر اندھیرا ہے"۔ اندر آکر کہا۔

"کہیں تار بگڑ گیا ہے"۔ میں نے چاہا وہ بجلی نہ جلائے۔ ورنہ میرے منحوس چہرے پر جو ٹھیکرے ٹوٹ رہے ہیں وہ کیسے چھپیں گے؟"

"کہاں خراب ہے یونہی بھی؟" میز کا لیمپ جلا کر ریڈیو کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی سے ریڈیو کو مروڑتے رہے۔ کھڑ کھڑ، شڑ شڑ، گھر گھر، میرے آنسو نکل آئے۔

میں نے نئے جائے تقرر کی بابت پوچھا "کس جگہ ہے"۔

"دوزخ"۔ گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں؟ جنگی تو پر فضا ہوتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"ہوں شاعروں کے لئے۔"

یا اللہ! کدھر سجدہ کروں؟ یہ تغیّر۔

"نہیں درندوں کے لئے بھی۔" میں نے جواب دیا۔ پھر پچھتانے لگی کہ میرا تو ارادہ ہی بے تکلف ہوتے کا نہ تھا۔

"مگر پالتو درندوں کے لئے نہیں، جو پنجرے کے عادی ہو چکے ہوں۔"

آواز کی نرمی مجھے متحیر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

"مگر آپ کو تو تنہائی پسند ہے۔ شکار تو خوب ہوتا ہوگا۔"

"خاک۔" ذرا جلی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں، عباس، شہاب، نہ جانے کون کون تھے، ان کا ذکر آپ مزے لے کر کرتے تھے۔

"وہ ــــ عباس اپنی بیوی کو لے آیا۔ شہاب کی ستمبر میں شادی ہوگئی۔ محمود دوڑ دوڑ کر دہلی جاتا رہتا ہے۔ ضیا کو تو جانتی ہو جنوبی ٹھہرے۔" یہ اس طرح کہا جیسے کوئی بچہ جس کے سارے کھلونے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے ہوں، اور ماں نئے کھلونے منگاتے سے انکار کر دے۔

میرے حلق میں سوکھا سو کھا پھندا پڑنے لگا۔

"چھٹیاں ہیں؟"

"نہیں تو لے کر آیا ہوں۔"

"کیوں۔"

"ایک ضروری کام تھا۔"

"آپ کو اور کام؟ دہی گئے ہوتے تو قریب پڑتا۔" میں نے تنگ کرنا شروع کیا۔

"ہاں ــــ وہ ــــ میں نے اسٹیشن پر اخبار دیکھا تھا۔ مبارک، یاد دینا تو

بھول ہی گیا"۔ کھسیانی ہنسی۔

"اوہو تو اس لئے آئے ہوں گے آپ۔ شکریہ۔ منظور سے تو آپ کو ہمدردی ہوگی نا ہ؟"

"ہاہاہا۔ خود کردہ را علاج نیست۔ کس نے کہا تھا اس سے کہ دریا میں کود۔ اب کودا ہے تو ہاتھ پاؤں مارے"۔ وہ کریہہ قہقہہ جسے سن کر مجھے ہسٹریا کا دورہ پڑنے لگتا ہے، اپنے مخصوص جھکولوں کے ساتھ گونجا۔ مگر میں نے ضبط کیا۔

"مارچ میں شادی ہوجائے گی، سیدھے کشمیر چلے جائیں گے۔ وہاں برف ــــ" میں نے مصنوعی مسرت سے کہا۔ گو دل پر برف کے تودے جمے ہوئے تھے۔

"مگر منظور تو تمھیں پسند نہ تھے"۔ وہ ایک دم بولے۔

"اوہ، وہ میری غلطی تھی ـــــ وہ فرشتہ ہیں ـــــ" میں نے کم از کم آخری لفظ تو دل سے کہے۔

"ہاں ـــــ ہے تو ـــــ پرکٹا فرشتہ"۔ اور پھر وہی پاگل کن قہقہہ۔ "بڑی جلدی فیصلہ کرلیتی ہو"۔

"ہاں ناقص العقل جو ٹھہرے ہم لوگ۔ خیر منظور جانتے ہیں۔ وہ میری غلطیوں سے بھی پیار رکھتے ہیں"۔

"بڑے عقل مند ہیں پھر تو!"۔ ایسے طعن سے کہا کہ میرا جی چاہا منہ نوچ لوں بیوقوف کا۔

مگر میں بولے ہی گئی"۔ وہ فرشتہ ہیں ـــــ میں نے تو ان سے کہہ دیا تھا ـــــ یہاں تک کہہ دیا تھا ـــــ"

"کیا کہہ دیا تھا"۔ وہ ریڈیو پر دور کا کوئی اسٹیشن لگا کر بولے۔

شکر تھا کہ لمپ ذرا آڑ میں تھا۔ اور مجھے تاریکی نے اپنی پناہ میں لے رکھا تھا۔ میرا

جھتی ذرا آگے کو جھکا۔ اسٹول پر بیٹھا تھا۔ بے ترتیب بال، باغیانہ ڈھٹائی سے پیشانی کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ چوڑے شانے لمپ کی روشنی سے میرے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر وہی کچھ تلخ سی مسکراہٹ، میرا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ میں نے بمشکل اس سکی کو روکا جو میرے ہونٹوں پر مچل رہی تھی۔ ریڈیو کی آواز اونچی کرنے کے لئے میں نے ہاتھ بڑھایا اور ادھر سے انھوں نے۔ تھوڑی دیر کے لئے میری انگلی ان کے گرم ہاتھوں سے مس ہو گئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ریڈیو لیک کر رہا ہے۔ میری آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ اور منظور کی انگوٹھی اس کی گرمی سے پگھلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مگر میں نے سختی سے اس ایکٹر کی طرح شروع کیا جو اپنا پارٹ شروع ہی سے بھول چکا ہو۔ اور ہال میں بد تمیز دو آنے والے تماشائی تالیاں بجاتے آئے ہوں،

"کچھ بھی ہو — انھوں نے تو یہ تک کہہ دیا — میں نے جب کہا کہ میرا کیا بھروسہ، شادی کے بعد ہی میں بدل جاؤں، اور چل دوں گھر بار چھوڑ کے۔ تو وہ بولے۔"

"کیا بولے؟" انھوں نے سکون سے کہا۔ اور لاپرواہی سے سگریٹ تلاش کرنے کے لئے جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں۔

"اوہ۔ منظور فرشتہ ہے۔ اس نے کہا۔ تم چلی آنا۔ میں بچوں کو پال لوں گا۔" میرے گلے میں آواز اٹک گئی۔

"ہیں؟ — کیا؟ — کیا کہا — پھر تم نے کیا کہا؟" خواہ مخواہ میرا دل دکھانے کے لئے حیرت کا اظہار کرنا تو اس کی خصلت میں داخل ہے۔

"پھر کیا؟ — مجھے عمر میں پہلی مرتبہ اس وقت منظور پر پیار آیا — اور —

"کیا؟ تمھیں — پیار — آیا!!!"

"اور کیا، وہ ہے ہی پرستش کے قابل۔ اور کیا کرتی میں۔"

"تم نے اسے گھر سے نکلوا دیا ہوتا۔ لاحول ولا قوۃ۔"

"کیوں ہ؟"

وہ تھوڑی دیر حیرت سے منہ پھاڑے بیٹھا رہا۔ کمبخت کی شکل باوجود ان باتوں کے کس قدر جاذب نظر تھی۔ اس نے اپنا اسٹول میرے بالکل قریب گھسیٹ لیا لیکن میں صوفے کے آخیر کونے پر کھسک گئی۔ ادھر میں خود کو کس قدر محفوظ سمجھ کر اور سکون سے بیٹھی تھی۔ تین ہفتے تین صدیوں کی طرح کٹے تھے۔ پر گزر تو چکے تھے۔ اور اب جب میں نے اپنی پناہ کی جگہ ڈھونڈلی تو یہ پھر مجھے بہکانے آگیا۔ شیطان سانپ کا بھیس بدل کر حوا کو بہکانے آیا تھا۔ اور پھر وہ ــــ میں نے خود کو ہوش میں لانے کے لئے زور سے اپنی ران میں چٹکی بھر لی اور دانت بھینچ لئے۔

"تم عورت ہو" وہ سختی سے بولا۔

"یقیناً"۔ میں نے وثوق سے کہا۔

"اور پھر تم مجھ سے پوچھتی ہو ــــ کہ کیوں ہ؟"

"یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ تمھاری دلیل بالکل فضول ہے"۔

"کیا تم واقعی اسے پسند کرتی ہو؟ ــــ میرا مطلب ہے منظور کو"۔ وہ ایک دم بولے۔

"کس قدر واہیات سوال ہے"۔ میں نے حقارت سے کہا۔ "اور ــــ"

"مگر ــــ میں سوچتا ہوں ــــ" اس نے اپنا ہاتھ صوفے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچتے ہیں آپ"۔ میں نے رکھائی سے کہا۔

وہ اور بھی قریب آگیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں سوچتا ہوں"۔ آواز میں کسی قدر نرمی تھی۔ "میں یہ کہنے آیا تھا کہ میں غلطی پر تھا۔ جنگل بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ خصوصاً تنہائی میں ــــ سنو تو ــــ"۔ مجھے بولنے سے روک دیا۔ "میں تنہائی نہیں پسند کرتا ــــ اب پسند نہیں کرتا ــــ سنو تو میرا دھیان بہت

دل گھبراتا ہے۔"

"ہوں۔" میں نے بالکل انھیں کی طرح لاپروائی سے کہا۔

"میں —— دیکھو بچے وچے کچھ نہیں پالوں گا۔ اگر تم ان کو چھوڑ کر چلی گئیں تو انھیں روز پلّوں کی طرح پیٹوں گا۔ اور ——" پھر بھنا اٹھا۔

میں بمشکل اپنی ہنسی گھونٹ سکی۔

"اور یہ ناممکن کہ تم مجھے چھوڑ کر جا سکو۔"

"کیوں؟ —— یہ کیوں؟" میں نے کہا۔

"یہ یوں کہ —— کہ —— میں —— چھوڑو بھی اس بات کو —— لاحول ولاقوۃ ایک دفعہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد" —— وہ بالکل قریب جھک گیا۔

"کون بیوقوف تم سے شادی کر رہا ہے —— ذرا ہوش میں۔" میں نے پیچھے سرک کر کہا۔

"تم سنتی تو ہو نہیں —— میرا وہاں بہت دل گھبراتا ہے۔ اور میں ——" پھر بچوں کی طرح کہا۔

"تو میں کیا کروں۔ بلا سے گھبرائے آپ کا دل۔ جی ہاں مجھے کیا؟"

"بڑی خوب صورت جگہ ہے، تم کہوگی کہ بس جنت ہے۔" سرور سے آنکھیں نیم باز کر کے کہا۔

"بس معاف رکھیئے اپنی جنت سے۔" میری آواز کمزور تھی۔

"ہیں! —— ایک بات سنو۔" انھوں نے اپنا دہکتا ہوا گرم ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔

"ہاں۔ کیا؟" میں نے کہا۔ اور سنسنی آنے لگی۔ ہلکی ہلکی کمزوری بڑھنا شروع ہوئی۔

"تم —— سب کچھ سمجھتی ہو —— کیوں ہے نا؟ پر بنتی ہو۔" وہ اور آگے جھکے۔

صوفے پر پیچھے سرکنے کی جگہ بھی تو نہ تھی۔

"اونہہ — بھئی"۔ میں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح انھوں نے میری گود میں سر ڈال دیا۔ اس وقت!

"گھر، گھر۔ پھٹ شوں۔ فش۔" باہر برآمدے میں موٹر بھنّا رہی تھی —!

"ارے پنکچر!" منظور کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ اور ہم چوروں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

ساس

سورج کچھ ایسے زاویہ پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے گھر میں ہی گرمی اور روشنی پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رخ سے گھسیٹی اور اے لو وہ پھر پیروں پہ دھوپ۔ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھمادھم اور ٹھٹوں کی آواز چھت پر سے آئی۔

"خدا غارت کرے پیاروں پیٹی کو۔" ساس نے بے حیا بہو کو کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی تھی۔

"دنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کاہے کو جیے۔ اے لو دوپہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر، ذرا ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آن پہنچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔"

"بہو . . . . ق . . . . ." بڑھیا نے بلغم بھرے حلق کو کھڑکھڑا کر کہا۔ "اری او . . . . بہو!"

"جی آئی۔" بہو نے بہت سی آوازوں کے جواب میں کہا۔ اور پھر وہی دھمادھم . . . جیسے کھوپڑی پہ بھوت ناچ رہے ہیں۔

"ارے تو آچک خدا سمجھے تجھ سے"۔ اور دھم دھم۔ چھن چھن کرتی بہو سیڑھیوں پر سے اتری اور اس کے پیچھے کتوں کی ٹولی۔ ننگے ادھ ننگے، پیچپاپ منہ داغ، ناکیں سڑ سڑاتے کوئی پون درجن بچے، کھی کھی، کھی کھی، کھوں کھوں، سب کے سب کھمبوں کی آڑ میں شرما شرما کر ہنسنے لگے۔

"الٰہی یا تو ان حرامی پلوں کو موت دے، یا میری مٹی عزیز کر لے۔ نہ جانے یہ اٹھائی گیرے کہاں سے مرنے کو آجاتے ہیں ـــــ چھوڑ دیئے ہیں جن جن کے ہماری چھاتی پر مونگ دلنے کو ـــــ" اور نہ جانے کیا کیا۔ پر بچے مسکرا مسکرا، کر ایک دوسرے کو گھونسے دکھاتے رہے۔

"میں کہتی ہوں تمہارے گھروں میں کیا آگ لگ گئی ہے ـــــ جو"

"واہ۔ تم تو مر گئی تھیں"۔ بہو نے بشریا کے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا۔

بڑھیا جملے کو اپنی طرف مخاطب سمجھ کر تلملا اٹھی۔

"جھاڑوں پھیروں تیری صورت پہ۔ مریں تیرے ہوتے سوتے، تیرے . . ."

"واں۔ ہم تمھیں کب کہہ رہے تھے"۔ بہو نے لاڈ سے ٹھنک کر کہا۔

مگر بڑھیا کو سے گئی اور بچوں کو تو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بچاروں کو منہ چرا کے بھاگتے ہی بنی۔ اور بہو بھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"دنیا جہان میں کسی کی بہو بیٹیاں یوں لونڈوں کے ساتھ کدکڑے لگاتی ہوں گی؟ دن ہے تو لونڈھیار، رات ہے تو . . . ." ساس تو زندگی سے تنگ تھی۔

"غن غن۔ غن غن"۔ بہو منمنائی۔ اور طوطے کے پنجرے میں پنکھے سے تنکے نکال نکال کر ڈالنے لگی۔ "ٹیں ٹیں"۔ طوطا چنگھاڑا۔

"خاک پڑی اب یہ طوطے کو کیوں کھائے لیتی ہے"۔ ساس غرائی۔

"تو یہ بولتا کیوں نہیں"۔ بہو نے جواب دیا۔

"تیری بلا سے۔ نہیں بولتا ـــــ تیرے باپ کا کھاتا ہے ـــــ"، ساس نے پہلو بدل کر کہا۔

"ہم تو اسے بلائیں گے"۔ بہو نے اٹھلا کر طوطے کے پنجے میں تنکا کونچ کر کہا۔

"آئیں ـــــ آئیں ـــــ اے میں کہتی ہوں تیرا چیتا ہی پگھل گیا ہے۔ اب ہٹتی ہے وہاں سے کہ لگاؤں"۔ بڑھیا نے دھمکی آمیز پہلو بدل کر کہا۔ اور جب بہو نے اور سنگایا تو کھڑاؤں کی شکل کی جوتی اٹھا کر ایسی تاک کر ماری کہ گھڑونچی کے نیچے سوئے ہوئے کتے سے لگی جو بلبلا کر بھاگا اور بہو کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ بڑھیا نے دوسری جوتی سنبھالی اور بہو کھمبے کی آڑ میں۔

"آنے دے اصغر کے بچے کو ـــــ"

"بچہ ۔۔۔۔"۔ بہو کو بچے کے نام پر بجائے شرمانے کے ہنسی دبانا پڑی۔

"تھو ہے تیرے جنم پر۔ اے اور کیا۔ بچہ بھی آج کو ہو جاتا جو کوئی بھاگوان آتی۔ جس دن سے قدم دھرا گھر کا گھر داہو گیا"۔

بہو اور مسکرائی اور طوطے کا پنجرہ جھکول ڈالا۔

"میں کہتی ہوں یہ طوطے کی جان کو کیوں آ گئی ہے"۔

"تو یہ بولتا کیوں نہیں ـــــ ہم تو اسے بلائیں گے"۔

بڑھیا جل کر کوئلہ ہو گئی۔ "یہی ڈھنگ رہے تو اللہ جانتا ہے دوسری نہ کر لائی ہوں تو نام نہیں ـــــ"

دھوپ ڈھل کر گھڑونچی اور وہاں سے کنڈیلی پر پہنچی۔

ساس بڑبڑاتی رہی۔ "موئے نقفتے بیٹی کو کیا جہیز دیا تھا ـــــ اے واہ قربان جائیے۔ خونی کڑے۔ اور ملمع کی بالیاں۔ اور ۔۔۔۔"

"تو ہم کیا کریں"۔ بہو پھوٹ پڑنے سے بڑبڑائی اور کھٹولی پر پسر کر لیٹ گئی۔

"اور وہ ایلومونیم کے ....." جمائی لے کر بڑھیا نے پٹاری پر سر رکھ کر ذرا ٹانگیں پھیلا کر کہا ـــــ اور پھر سونے سے پہلے وہ سمدھنوں کے گھٹنوں پر سے گھسے ہوئے گلبدن کے پاجاموں۔ پھیکے زردے اور گھنے ہوئے پایوں والے جہیز کے پلنگ کا ذکر کرتی رہی۔ مگر بے حیا بہو آدھی کھٹولی اور آدھی زمین پر لٹک کر سو بھی گئی۔

بڑھیا کی بڑبڑاہٹ بھی خراٹوں میں نہ جانے کب بدل گئی۔

اصغر نے چھتری کو کھمبے سے لگا کر کھڑا کیا اور کشتی چھاپے والی نیلی واسکٹ کو اتار کر کرتے پسینے کے آبشار پونچھتے ہوئے دالان میں قدم رکھا۔ پہلے بڑی احتیاط سے ایک شریر بچے کی طرح روٹھ کر سوئی ہوئی بڑھیا پر نظر ڈالی۔ اور پھر بہو پر۔ آموں اور خربوزں کی پوٹلی کو زمین پر رکھ کر کچھ کھجایا اور جھک کر بہو کی بانہہ کھینچ دی۔

"اوں ـــــ" بہو تیوریاں چڑھا کر اینٹھی اور اس کا ہاتھ جھٹک مڑ کر سو گئی۔

اصغر نے پوٹلی اٹھائی۔ جیب میں نئی چوڑیوں کی پڑیا ٹٹولتا کوٹھری میں چلا گیا۔ بہو نے ہوشیار بلی کی طرح سر اچکا کر بڑھیا کو دیکھا اور دوپٹہ کڑھیڑتی چھپاک سے کوٹھری میں۔ لو، رک گئی پسینے کے شراٹے چل نکلے۔ مکھیاں آموں کے چھلکوں اور کوڑے سے نیت بھر کے، منہ کا مزہ بدلنے بڑھیا کے اوپر رینگنے لگیں۔ دو چار نے باچھوں میں بہی ہوئی پیک کو چکھنا شروع کیا۔ دو چار آنکھوں کے کوئے میں تندہی سے گھسنے لگیں... کوٹھری میں سے ایک گڑگڑاتی ہوئی بھاری آواز اور دوسری چنچناہٹ۔ "اوں ـــــ اوں" سنائی دیتی رہی۔ ساتھ ساتھ خربوزوں کے چھلکوں اور آموں کے چوڑنے کی چپڑ چپڑ آواز سکون کو توڑتی رہی۔

مکھیوں کی چہلوں سے دکھی ہو کر آخر بڑھیا پھڑپھڑا ہی اٹھی۔ یہ مکھی ذات بچی کے ساتھ لگی تھی ـــــ پیدا ہوتے ہی گھٹی کی چپچپاہٹ سونگھ کر جو مکھیاں منہ پر بیٹھنا شروع ہوئیں تو کیا سوتے کیا جاگتے بس آنکھ ناک اور ہونٹوں کی طرح یہ بھی جسم کا ایک

عضو بن کر ساتھ ہی رہتی تھیں ـــــ اور ایک مکھی تو نہ جانے سالہا سال سے اس کی دشمن ہو گئی تھی۔ جب لکھنؤ میں تھی جب کاٹا ـــــ پھر جب اناؤ گئی تو برسات میں پھر کاٹا۔ اور لوسندیلہ میں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اگر بڑھیا کو معلوم ہوتا کہ اسے اس کے جسم کے کون سے مخصوص حصے سے انس ہے تو وہ ضرور وہ حصہ کاٹ کر مکھی کو دے دیتی۔ مگر وہ تو ہر حصہ پر ٹہلتی تھی۔ وہ کبھی کبھی غور سے اسی خاص کنکھنی مکھی کو دیکھتی۔ وہی چتلے پر، ٹیڑھی ٹانگیں اور مٹکا سا سر۔ وہ بڑے تاک کر پنکھے کا جھپاکا مارتی ـــــ مکھی تنن تنن کرکے رہ گئی ـــــ آہ معبود! اسے کتنا ارمان تھا کہ وہ کبھی تو اس مکھی کو مار سکے ـــــ لنگڑا ہی کر دے۔ اس کا بازو مڑوڑ کر مرغی کی طرح گدی باندھ کر ڈال دے اور مزے سے پاندان کے ڈھکنے پر رکھ کر تڑپتا دیکھے۔ مگر خدا تو شاید اس مکھی سے بھی شیطان کی طرح قول ہارے بیٹھا تھا کہ بس ستائے جائے۔ اس کی ایک حقیر بندی کو نہ جانے اس سے کیا مزہ آتا ہے۔ مگر اسے یقین تھا کہ اس دوزخی مکھی کا گریبان ـــــ اس مکھی کی فریاد ضرور اس قہار و جبار کی حضور میں لے کر جائے گی اور ضرور فرشتے اسے خون پیپ پلا کر کانٹوں پر سلائیں گے.....
مگر پھر..... کیا یہ موئی کاٹی مکھیاں بھی جنت میں جائیں گی! ـــــ اور ساری جنتی فضا مکدر ہو جائے گی۔ بڑھیا نے پنکھے کی پتوار بنا کر چھپا چھپ اپنے منہ، ہاتھوں اور سوکھے پیروں کو پیٹ ڈالا۔

"بہو ـــــ اے بہو۔ مر گئی کیا"۔ وہ جل کر چلائی۔

اور بہو تڑپ کر کوٹھری سے نکلی۔ دوپٹہ ندارد، گریبان چاک۔ ہاتھ میں آم کی گٹھلی، جیسے کسی سے کشتی لڑ رہی ہو ـــــ پھر فوراً لوٹ گئی اور دوپٹہ کندھوں پر ڈالے آنچل سے ہاتھ پونچھتی نکلی۔

"ارے بہو ـــــ میں کہتی ہوں ـــــ ارے دو بوند حلق میں پانی"۔
اصغر بھی شلوار کے پائنچے جھاڑتا کرتے کی پوٹلی سے گردن رگڑتا آیا۔

"لو اماں ــــ کیا خوشبودار امیاں ہیں"۔ اس نے بڑھیا کی گود میں پوٹلی ڈال کر کہا۔ اور کھٹولی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

بڑھیا آموں اور خربوزوں کو سونگھ سونگھ کر مکھیوں کی ناانصافی کو بھول گئی جو اب آموں کی بونڈیوں کا معائنہ کرنے کے لئے اس کی باچھوں سے اتر آئی تھیں۔

"اے بہو چھری ......"

بہو نے گلاس دیتے ہوئے آموں کا رس ہونٹوں پر سے چاٹا۔ اصغر نے پیر بڑھا کر بہو کی پنڈلی میں بکچا بھر لیا۔ پانی چھلکا اور بڑھیا غرائی۔

"اندھی۔ میرے پاؤں پر اوندھائے دیتی ہے"۔ اور ایسا کھینچ کر ہاتھ مارا کہ گلاس معہ بھاری پیندے کے بہو کے پیر پر۔ بہو نے دانت کچکچا کر اصغر کو گھورا اور چل دی تنتناتی۔

"اماں لو پانی"۔ اصغر نے فرماں بردار بیٹے کی طرح پیار سے کہا۔ "یہ بہو تو بڑی وہ ہو گئی ہے"۔

"تمھیں دیکھو"۔ بڑھیا نے شکایت کی۔

"نکال دو مار کے حرام زادی کو۔ اماں اب دوسری لائیں۔ یہ تو ــــ" اصغر نے پیار سے بہو کو دیکھ کر کہا۔

"ارے زبان سنبھال کمینے!"۔ بڑھیا نے آم پلپلا کر کہا۔

"کیوں اماں، یہ دیکھو ناکھا کر بھینس ہو رہی ہے"۔ اس نے بڑھیا کی آنکھ بچا کر کمر میں چٹکی بھر کے کہا اور بہو نے چھری مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے چھری بڑھیا کے گٹے پر پٹخ دی۔ جو تلملا گئی۔

"دیکھتی ہو اماں ــــ اب ماروں چڑیل کو"۔ اور لپک کر اصغر نے دیا دھموکہ بہو کی پیٹھ پر۔ اور فرماں بردار بیٹے کی طرح پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"خبردار لو ــــ اور سنو۔ ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی اب کے جو تو نے ہاتھ اٹھایا"۔ بڑھیا غنیم کی طرف داری کرنے لگی۔"کوئی لائی بھگائی ہے۔۔۔۔ جو تو ــــ اے میں کہتی ہوں پانی لادے"۔ اس نے ایکدم پھر بہو پر برسنا شروع کیا۔

بہو کھمبے سے لگ کر منہ تھوتھا کر بیٹھ گئی اور گلاس سے زخمی ہوئے انگوٹھے کو دبا دبا کر خون نکالنے لگی۔ بڑھیا مزے سے گٹھلیاں چوڑا کی اور پھر شکر کا ڈبہ دیتے وقت کچھ ایسا بڑھا کے پاؤں رکھا کر خون سے لتھڑا انگوٹھا بڑھیا نے دیکھ ہی لیا۔

"اوئی یہ خون کیسا؟ ــــ" پر بہو روٹھ کر پھر کھمبے سے لگ کر بیٹھ گئی اور خون بہنے دیا۔

"اے میں کہتی ہوں ادھر آ ــــ دیکھوں تو خون کیسا ہے؟ ــــ" بڑھیا نے پریشانی چھپا کر کہا۔

بہو ہلی بھی نہیں۔

"دیکھو تو۔ کیسا جیتا جیتا خون نکل رہا ہے۔ اصغر اٹھ تو ذرا اس کے پیر پر ٹھنڈا پانی ڈال"۔ ساس بھی گرگٹ ہوتی ہے۔

"میں تو نہیں ڈالتا"۔ اصغر نے ناک سکیڑ کر کہا۔

"حرام زادے!" بڑھیا خود گھسٹتی ہوئی اٹھی۔

"چل بیٹی پلنگ پر۔ اے میں کہتی ہوں یہ گلاس موا سوا سیر کا ہے۔ اس کمینے سے کتنا کہا ہلکا المونیم کا لادے۔ مگر وہ ایک حرام خور ہے۔ لے اٹھ ذرا"۔ بہو ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بلکہ کہنی آگے کر کے جھوٹ موٹ ناک دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

"لا پانی ڈال صراحی میں سے"۔ اور اصغر سینے پر پتھر رکھ کر اٹھا۔

بڑھیا سوکھے سوکھے لرزتے ہاتھوں سے خون دھونے لگی۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ بجائے زخم پر پانی ڈالنے کے وہ بہو کے گریبان میں دھار ڈال رہا ہے اور بہو اس تاک

میں ہے کہ قریب آتے ہی اصغر کا کان دانتوں سے چبا ڈالے۔ وہ ایکدم بکھر گئی۔
"خاک پڑے تیری صورت پر"۔ بڑھیا نے اصغر کے ننگے شانے پر سوکھے پنجے سے بدھیاں ڈال کر کہا۔ اور اس نے ایک سسکی لے کر جل کر سارا پانی بہو پر لوٹ دیا۔ اور خود روٹھ کر آم کھانے چلا گیا۔ ماں بیٹے کے لئے ڈھائی گھڑی کی موت آنے کا ارمان کرنے لگی۔

"بدذات۔ ٹھہر جا۔ آنے دے۔ اپنے چچا کو وہ کھال ادھیڑوائی ہو کہ بس ——"
بڑھیا نے سیلی دھجی کی پٹی باندھ کر کہا۔
"لے بس اب پلنگ پر لیٹ جا"۔ بڑھیا نے زخم کو انتہائی خطرناک بنا کر کہا۔ اور پھر بہو کے نہ ہلنے پر خود ہی بولی "اے ہاں —— لے اصغر بہو کو کھٹولی پر پہنچا دے"۔
"مجھ سے تو نہیں اٹھتی۔ یہ موٹی بھینس کی بھینس"۔ اصغر جل کر بولا۔
"ارے تیرے تو باپ سے اٹھے گی —— سنتا ہے کہ اب ——"
اور جب وہ پھر بھی بیٹھا رہا تو بڑھیا خود اٹھانے لگی۔
"اماں۔ میں آپ اٹھ جاؤں گی"۔ بہو نے بڑھیا کی گدگدیوں سے گھبرا کر کہا۔
"نہیں بیٹی —— میں ——" اور اس نے پھر اصغر کی طرف آنکھیں گھما کر دیکھا گویا کہہ رہی ہے کہ ٹھہر جاؤ میاں دودھ نہ بخشوں اور پر نہ بخشوں۔
اصغر بھنا کر اٹھا اور ایک چھپاکے سے بہو کو اٹھا کر چلا کھٹولی کی طرف۔ بہو نے موقع کی مناسبت سے فوراً فائدہ اٹھا کر اسی جگہ دانت گاڑ دیئے جہاں ابھی ساس کا سوکھا پنجہ پڑا تھا۔ اور اصغر نے جھکیا کر اسے کھٹولی پر پٹخ دیا اور اس کے سرخ سرخ ہونٹ بہ چٹکی بے سل دیئے۔
بہو ناک چھپا چھپا کر فتح مندانہ طریقے پر ہنستی رہی اور اصغر اپنے نیل پڑے ہوئے کندھے کو سہلا سہلا کر غراتا رہا —— ساس وضو کے آخری مراحل طے کر رہی تھی اور آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر کچھ بڑبڑا رہی تھی —— جانے کیا۔ شاید بے حیا بہو کو کوس رہی ہو گی۔

سفر میں

کاش یہ ریلیں ذرا کم ہلا کرتیں! گھڑ گھڑ۔ پھٹ پھٹ۔ جھڑ جھڑ۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہیے اب نکلے اور اب نکلے۔ ریل میں بیٹھ کر انسان کن کن عجیب و غریب زاویوں سے ہلتا ہے۔ آڑا ترچھا۔ پھر گول گول چکروں کی صورت میں اور پھر شمال سے جنوب کی طرف اور کندھے مشرق اور مغرب کی سمتوں میں جنبش کرتے ہیں۔ اور لٹکی ہوئی ٹانگیں مثلث بنانا شروع کر دیتی ہیں۔ پانی کا گلاس کئی دفعہ نشانہ باندھنے کے باوجود کبھی کبھی ٹھوڑی اور کبھی ناک سے ٹکرا کر پانی چھلکا دیتا ہے۔ اس سے تو چھکڑے ہزار درجہ بھلے تھے۔ جب ہلتے ہلتے انسان تھک جائے تو ٹھہر تو سکتا ہے۔ مگر یہاں ریل میں تو بس ہلو، ہلو اور پاگل ہو جاؤ۔

سامنے بیٹھا ہوا انسان ہلنے کے ساتھ ساتھ پھسلنے بھی لگا۔ اس کی ٹانگ جو پہلے ہی ران تک کھلی ہوئی تھی اور بھی آگے کھلنے لگی۔ نہ جانے کس عجیب طریقے سے دھوتی باندھی تھی کہ گزوں کپڑا لپٹا ہونے کے باوجود ہر جنبش خطرناک طور پر اسے برہنہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ کاش وہ جاگ جائے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے دعا مانگنا شروع کی۔ کاش وہ ایک دم ہی تڑپ کر اس کپڑوں کی گٹھری میں سے نکل آئے! یہ سسک سسک کر جو اس کی دھوتی

برابر کھسک رہی ہے اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ایک دم فیصلہ کر دے! تین اسٹیشنوں سے یہی جانکنی سی طاری ہے۔ بڑی معیوب سی بات ہے۔ لیکن ایسے موقع پر خواہ مخواہ نظر اٹھتی ہے اور ہے یہ بڑی عجیب بات کہ کوئی اسے کچھ نہیں کہتا۔

میری سیٹ سے ذرا ہٹ کر ایک پوری سیٹ لبالب ایک عورت سے بھری ہوئی تھی۔ پہاڑ کی پہاڑ عورت نہ جانے کیسے ایک بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ ساری رات بچہ دودھ پیتا رہا اور بالکل غافل سوتی رہی۔ جب کوئی اسٹیشن آجاتا تو بچہ کوں کوں کر کے چٹر چٹر منہ مارنے لگتا۔ عورت کا پلپلا پلپلا جسم ہر جنبش پر مختلف سمتوں میں ہل رہا تھا۔ بچہ پیٹ پر چھپکلی کی طرح چپکا ہوا برابر دودھ پی رہا تھا۔ گویا وہ پیدا ہی اس ضروری کام کے لئے ہوا ہے۔ وہ رات بھر دودھ پیتا رہا۔ اب پی رہا تھا اور نہ جانے اسے ابھی کتنا اور پینا تھا۔ اوندھا ہونے کی وجہ سے اس کی ناک پچکی جاتی تھی۔ جس میں سے غلاظت کے بلبلے نکل کر ہوا میں پھوٹ رہے تھے۔

کاش بچہ دودھ ذرا کم پیتا۔ اور وہ ننگی ٹانگ والا مسافر دھوتی سنبھال لیتا۔ تو میرا سفر اتنا تلخ نہ ہوتا۔ ریل کے جھٹکوں نے نئے زاوئے اختیار کر لئے تھے اور جسم کو ذرا مختلف اطراف میں ہلنے میں نسبتاً سکون مل رہا تھا۔

جب تک ریل چلتی رہتی ہے، ڈبہ کی بدبو ذرا دبی رہتی ہے۔ ریل رکتے ہی پسینہ اور میلے کپڑوں کے بھبکے اٹھنے لگے۔ باہر چند بے فکرے نوجوانوں نے ٹہلنا شروع کیا۔ کاش کوئی ہمارے نوجوانوں کو آوارگی سکھا سکتا۔ جی ہاں آوارگی بھی ایک ہنر ہے! مجھے یاد ہے کہ چوراہے پر سے گذرتے وقت ایک انگریز سپاہی کھڑا رہتا تھا۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ پر وہ کچھ اس مزے سے "ٹوئی" کر کے سیٹی بجاتا تھا کہ لطف آجاتا تھا اور اس کی کرنجی آنکھ شرارت سے جھپکتی تھی۔ تو ہم لوگ بے اختیار مسکرا دیتے تھے۔ ذرا غور کیجئے۔ بچہ، مسافر، جس کی دھوتی نئی کروٹ لینے کے بعد اور بھی خطرناک ہو چکی تھی۔ ریل کے ہچکولے اور

پھر غلط فہمی کا شکار، بیسویں صدی کے نوجوانوں کی بدمذاقی۔ جی چاہا۔ ان میں سے ایک کو بلا کر کہوں۔ "بھائی، یہ شعر جو تو گنگنا رہا ہے بہت پرانا ہے "شعلۂ طور" میں سے کوئی جلتا ہوا شعر پکڑ۔ اور تیرے بالوں میں جو آدھ نلے کا تیل ہے۔ آدھ درجن سروں کے لئے کافی ہوتا۔ اور تیری بائیں مونچھ دائیں مونچھ سے ذرا اونچی کٹی ہے۔ ابھرا ابھر کر تیرے ذوق کی داد دے رہی ہے۔ اور پان اتنا مت چبا تیری کچلیاں بہت نمایاں ہیں۔ پان کی پیک میں لتھڑ کر بڑی بھیانک ہو رہی ہیں۔ اور تو اتنی ڈھیلی دھوتی مت پہن۔ اور کرتا بھی بہت بڑا ہے۔ یہ جو تو نے سینما میں اشوک کمار وغیرہ کو بے گریبان کے بڑے بڑے تھیلے پہنے دیکھا ہے وہ تیرے اس ٹھگنے سے قد پر اچھے نہیں لگتے۔ اور..." مگر وہ ایک نئی بیاہی دلہن کو ڈبے میں سے جھانکتے دیکھ کر عجیب بھیانک حرکتیں کرنے میں مشغول۔ بھلا میری کیوں سنے گا۔ آہ۔ میری آنکھیں! جی چاہا مٹھی بھر کے ریت اٹھا کر جھونک لوں۔ ریل کا کوئلہ نہ جانے کتنا گھس آیا! میرا جی بری طرح متلا رہا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سارا دودھ جو بچہ پی رہا ہے اور پی چکا ہے میرے ہی حلق سے گذر رہا ہے اور منہ کا مزہ بدلنے کے لئے میں نے ڈلیا میں سے تنکے توڑ کر چبانا شروع کئے۔

دو قلی ہنسی مذاق میں باہم گتھم گتھا۔ عجیب و غریب گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ دوسری قوموں کی گالیاں بھولی اور غیر دلچسپ ہوتی ہیں۔ ہندوستانی دماغ کم از کم گالیوں کی ایجاد میں تو سب قوموں سے آگے ہے۔ جس نکتہ پر ہمارے یہاں گالیوں میں زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس کا اور لوگوں کو گمان ہی نہیں۔ ہزاروں آرٹ تو دنیا میں لاپرواہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارے ہندوستانیوں کے آرٹ کو تباہ کر ڈالا۔ انگوٹھے کاٹ ڈالے گئے کپڑا بنانے والوں کے۔ آپ اس بچہ کو لیجئے اور اس کی ماں کو۔ جو اٹھارہ گھنٹے سے دودھ پی رہا ہے۔ فی گھنٹہ حساب لگائیے تو کتنا پی چکا ہوگا۔ اور وہ ماں! اگر کسی تہذیب یافتہ ملک میں ہوتی، تو نہ جانے کتنے تمغے اور میڈل مل چکے ہوتے، اور مجھے بڑے

بڑے حروف میں بچے اور ماں کی حیرت انگیز حرکتوں کے متعلق "سنسنی خیز" الفاظ نظر آنے لگے۔ دبلا پتلا بچہ! باوجود اس تندہی سے جتے رہنے کے حیرت! حیرت زدہ ہوتے ہوتے میرا سر دکھنے لگا۔ اور میں نے اونگھنے کی کوشش کی۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔ کسی نے سر پر ہتوڑے مارنے شروع کیے۔ ٹکٹ بابو صاحب اپنا سر وتا کھڑکی کے پاس کھٹکھٹا رہے تھے۔ تھرڈ کلاس میں سفر کرنے والوں کے نہ تو شاید بھیجا ہوتا ہے۔ اور نہ اس میں احساس! جی چاہا پاگل ہو جاؤں۔

پاس ہی سکنڈ کلاس میں ایک کھدر پوش لیڈر نہ جانے رات کو کون سے اسٹیشن پر سوار ہو گئے تھے۔ جب وہ اسٹیشن پر اتر کر سر کھجاتے یا اخبار خریدتے تو میں برابر انھیں غور سے دیکھتی۔ انھیں دنوں میں ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ جس میں ایک معمولی عورت نے ایک بڑے مشہور آدمی پر طاری ہونا شروع کیا۔ اور ایسی پیچھے لگی کہ آخر میں اسے مرعوب کر کے چھوڑا۔ میرا ارادہ بھی ہمیشہ ہی سے کوئی ان ہونی اور سنسنی خیز حرکت کرنے کا ہے جو اور عام لڑکیوں نے نہ کی ہو۔ پہلے میں سوچا کرتی تھی۔ ایڈیٹر یا کوئی مشہور مصنف ٹھیک رہے گا۔ پھر میری رائے بدل گئی۔ آج کل لیڈر ذرا آنکھ میں جچتے ہیں۔

اور ان لیڈر صاحب کی آنکھیں بڑی بڑی، کھلی ہوئی پیشانی۔ دھوتی کے پلو سے کھیلتے ہوئے۔ وہ خاصے شریف آدمی معلوم ہو رہے تھے۔ کنپٹیوں پر سفید سفید بال جھلک رہے تھے۔ جو ان کے مفکر ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ جنکشن پر میں نے جان بوجھ کر بک اسٹال پر ان سے ملاقات کر لی۔

"ہماری استریاں ہی ہمیں آزاد کرا سکتی ہیں۔" انھوں نے میری ساری کے موٹے کھدر سے مرعوب ہو کر کہا۔ دل میں تو مجھے شرم آئی کہ ساری لیتے وقت میں نے ملکی بہتری سے زیادہ اسٹائل پر توجہ دی تھی۔ مگر انھیں کیا معلوم۔

میں نے جلدی جلدی ان سے نصیحتیں لینا شروع کیں۔

"صاحب عورتوں کی مدد کے بغیر ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔"

مجھے یاد آگیا۔ جب کالج کے زمانہ میں ایک دفعہ خوش رنگ جھنڈے لے کر ہم لوگ کھدر کی ساریاں پہن کر نکلی تھیں۔ سلطانہ کی پیلے رنگ کی ساری بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔ اور ششی نے اپنی مور کے رنگ کی ساری سنبھالتے ہوئے مجھے جلوس کے درمیان میں ہی اس کی ساری کے رنگ پر توجہ دلاتی تھی۔ اور اس وقت سلطانہ کے کانوں پر پڑے ہوئے بال بالکل کنٹوپ کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ ہاں زینب غضب کی لگ رہی تھی۔ پر وہ راستہ بھر نریندر صاحب سے فس کرتی گئی تھی۔ جوگی بے چاری نے ششی سے کتنی دفعہ ساری مانگی۔ مگر ششی کی ساری ساریاں جلوس والی لڑکیوں نے پہلے ہی لے لی تھیں اور وہ اسی روز نئی کھدر کی ساری لائی۔ جس کے کلف کی بو سے ناک اڑی جا رہی تھی۔

"استریوں کو کسی دکھ کی پروا نہیں کرنا چاہیئے"۔ وہ بولے۔

لیجئے! بھلا ہم لوگ دکھ کی پروا کریں گے۔ جلوس میں جاتے وقت دل سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ کاش پولیس مزاحمت کرے۔ ورنہ یہ تو کچھ بات نہ ہوگی کہ جلوس نکلے اور یونہی گشت لگا کر چلا آئے۔ جوگی تو یہاں تک کہتی تھی کہ "کاش لاٹھی چارج ہو ہم پر!" مگر وہ تو ہماری قسمت میں نہ تھا۔ پولیس کو جیسے ہمارے دل کا حال معلوم ہو گیا۔ اور جلوس پھسپھسا ہی رہتا۔ اگر ایک جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ کچھ "بندے ماترم" اور "ہندوستان ہمارا" پر رسا کشی ہوئی۔ ششی کو کھانسی آگئی۔ یہ جھگڑا یونہی دب گیا۔

"جس بات میں عورتیں حصہ نہ لیں۔ تو جانو گاڑی کا ایک پہیہ نہیں"۔

مجھے یاد آیا کہ بہت دن ہوئے میں نے ایک فلم دیکھا تھا۔ اس میں سوائے ایک بوڑھی ہوٹل والی کے اور کوئی عورت نہ تھی۔ اس قدر غیر دلچسپ فلم تو میں نے ساری عمر نہیں دیکھا۔ ہم سارا وقت اسی انتظار میں رہے کہ اب کوئی عورت آئے اور اصل تماشہ شروع ہو۔ اور سچ کہتی ہوں کہ ایک پہیہ کی گاڑی تو پھر بھی چل جائے وہ فلم تو ذرا بھی

نہ چلا۔

اور پھر مجھے ایک دم خیال آیا کہ ہم لوگ زندگی کو گاڑی سے کیوں تشبیہہ دیتے ہیں۔ چکی سے کیوں نہیں دیتے۔ یا چمٹے سے کیوں نہیں۔ یہ خیال بڑا بے تکا تھا۔ پر آگیا دل میں۔ اگر لیڈر صاحب کو میرے دل کی باتیں معلوم ہو جاتیں تو بس نہ جانے کیا کرتے۔ وہ کتنی دیر تک ایک کوڑھ مغز سے سر مارتے رہے۔ جس کے خیالات کا سر نہ پیر۔ مگر اس میں میرا کیا قصور کہ ایک بات پر مجھے ہزاروں الٹی سیدھی باتیں یاد آجاتی ہیں۔

پھر کچھ موجودہ نظام تعلیم کا ذکر ہونے لگا۔ دو تین اور آکر سننے لگے۔ ان میں سے ایک کی ناک سکڑے ہوئے لمبے چہرے پر عجیب چیز لگ رہی تھی۔ گویا ریگستان پر ایک تنبو تنا ہوا ہے۔ دانت ان کے بھی پھپھوندی لگے ہوئے تھے۔ میرا دل چاہا۔ کوئی ان کے دانت مانجھ دے، اور لیڈر کا لکچر سننے کے بجائے میں حیرت میں ڈوبی، یہ سوچ رہی تھی کہ اس شخص کی بیوی کیا کرتی ہو گی۔ کاش کوئی ان کے دانت مانجھ دیتا! اور میرا دل گھبرانے لگا۔ جی چاہا کسی نہایت خوبصورت آدمی کو دیکھوں جس کے دانت پھپھوندی چڑھے ہوئے نہ ہوں اور جس کی ٹانگ دھوتی میں سے ران تک نہ کھلتی ہو۔ اور جس کے کپڑوں میں سے ہلکی ہلکی نپتلین کی خوشبو آرہی ہو۔ اور اس کے سینے پر سر رکھ کر اتنا روؤں کہ سارا کوئلہ جو راستہ بھر میری آنکھوں میں جھونکا گیا تھا دھل جائے اور پیچے کے تصور سے جو میرا جی متلایا تھا...... اور وہ تین آوارہ مزاج بننے کی کوشش کرتے ہوئے نوجوان! قلی اور ان کی گالیاں۔ ریل کے ہچکولے.... یہ دنیا ساکت ہو جائے..... اور بس۔

اس کے خواب

جہاں کبھی ہو، سوتا ہو یا جاگتا، خواب برابر آتے رہتے ہیں۔ مزیدار، چٹپٹے، پھیکے، سیٹھے، دھندلے، روشن اور کبھی بالکل نظر ہی نہ آنے والے۔ خواب کسے نہیں آتے ؟ اور وہ تو اب جوان تھا۔ وہ جب ہی جوان ہو گیا تھا جب مہترانی کی جوان بہو اسے پرستان کی پری معلوم ہونے لگی تھی۔ اور اس کی چیپڑ بھری پیلی آنکھیں نرگس مستانہ اور بدبودار ہونٹ معتبر نظر آنے لگے تھے۔ جب وہ اپنی پتلی کمر جو ٹھوس اور پتھریلی آنکھوں کے لئے بینس جیسی نظر آنے لگی تھی، چمکاتی چلتی تو سینکڑوں مہتروں کا تو ذکر ہی کیا خود گوشت والے حاجی جی کا چھوٹا سالا۔ بندو کا بدمعاش بھتیجا اور نہ جانے کون کون مچھلیوں کی طرح بلبلانے لگتے۔ اور دھوبن کا تو کہنا ہی کیا۔ اس کی گندمی رنگت اور پھیلی ہوئی ناک، اس کی شاعرانہ نظروں کے تیر، اور جب وہ سڑاند اور بھبکتا اند سے بسے ہوئے چیتھڑوں کا پوٹلا لے کر ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی گلی میں پڑی ہوئی نجاست سے ایڑیاں بچاتی، نکلتی تو نہ جانے کتنے جی لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ہاں مگر وہ بھی نوجوان تھا اور پھر شاعرانہ طبیعت۔ نہ جانے یہ اللہ میاں شاعروں سے کیوں جلتے ہیں۔ ہزار بے چارا انھیں کی حمد و ثنا میں جتا رہتا ہے مگر وہ ہیں کہ اس

بے جان بوجھ کر رد ٹھتے ہیں۔ آخر کیوں؟ سب کچھ پڑھ لکھ لینے کے بعد بھی اسے نوکری کیوں نہیں ملتی؟ اونہہ! جیسے اسے نوکری کی پرواہ ہے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ لوگوں کے زور دینے پر آئی۔ سی۔ ایس"۔ پی۔ سی۔ ایس۔ اور نہ جانے کتنے "ایسوں" کے امتحان میں شریک ہوا۔ مگر شکر ہے کہ وہ فیل ہو ہو گیا۔ اور نہ قومی اور ادبی خدمت جس کے لئے وہ بنایا گیا تھا کس طرح کر سکتا تھا؟ اب تو وہ صرف ایک پرائیوٹ اسکول میں عیوضی پوری کر رہا تھا۔ چونکہ دو سال سے وہ برابر عیوضی کر رہا تھا اس لئے اس کی ترقی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ پر خواب کہیں پیسوں سے تھوڑی دیکھے جاتے ہیں۔ پیسہ کوئی دوربین تو ہے نہیں کہ آنکھ سے لگایا اور دور دور کی چیزیں دکھائی دینے لگیں۔ خواب دیکھنا تو مفت کا معاملہ ہے، وہ مزے سے چارپائی پر لیٹ جاتا ہے۔ کہنی کا مثلث بنا کر آنکھوں پر کھڑا کر لیتا۔ اس کا ایک پیر خود بخود دوسرے پیر پر چڑھ جاتا اور یہ آسن اسے سپنوں کی نگری میں پہنچا دیتا۔

وہ کتنی باتیں دیکھا کرتا! اس کا پرانا پلنگ اور گھٹا ہوا کمرہ جادو کے زور سے اڑ جاتے اور وہ اپنے کو ایک عجیب و غریب جنگل میں جاتا۔ جہاں ایک ضعیف سادھو بھگوان سے دھیان لگائے ہوتا۔ یقین کیجئے سادھو کبھی اکیلے نہیں ہوتے ان کے ایک لڑکی ضرور ہوتی ہے جس کی ماں نہیں ہوتی۔ اگر ماں ہو تو پھر مزہ ہی گیا۔ کمبخت سانپ کی طرح اس کے چاروں طرف کنڈلی مارے بیٹھی رہے گی۔ اور پھر سادھو اور اس کی لڑکی کا ہونا بالکل فضول ہے خواہ جنگل کتنا حسین اور سریلا کیوں نہ ہو۔ ہاں اور یہ لازمی ہے کہ وہ لڑکی حسین ہوئے انتہا حسین۔ بھلا سادھو کی لڑکی جنگل میں دریا کنارے کنول توڑ رہی ہو اور سیاہ، کھتری اور چپٹی ہو تو بے اختیار یہی جی چاہے گا کہ چڑیل کو پانی میں ڈبو دو۔ خیر تو اس کے جنگل کے سادھو کی بھی حسین لڑکی ہوتی۔ اب یا تو وہ گھوڑے پر سے گر پڑتا اور وہ لڑکی اس کا سر زانو پر رکھ کر ہوش میں لاتی یا پھر وہ پیاسا ہوتا اور کٹی میں جاتا اور سادھو اپنی حسین منورما، آشا، مادھوی جو کچھ بھی ہوتی اسے پکارتا اور وہ بجلیاں گراتی، آنچل کے شعبدے دکھاتی آتی اور لٹیا یا گلاس

میں تازہ بکریوں کا دودھ دوہ کر لاتی۔ شرمانا اس کے لئے اشد ضروری ہوتا اور اس کے جسم میں بجلی کوندانے کو اس کی پتلی انگلیاں شرطیہ طور پر چھو جاتیں اور جب یہ معاملہ ہو تو انجام معلوم ہی ہے۔ وہ دودھ پی کر تازہ ہو جاتا۔ سادھو کی یا تو ٹانگ ٹوٹی ہوتی یا اندھا ہوتا۔ یا اور کوئی بات ہوتی اور وہ دونوں اکیلے سارا سارا دن ندی پر کھیلتے۔ وہ اس وقت بالکل یہ بھول جاتا کہ اتنے دن اسکول میں عیوضی کون کرے گا۔ اور لڑکوں کو اگر معلوم پڑ جائے کہ "ماٹ صاحب" ندی کے کنارے راس رچانے جاتے ہیں تو پھر تو وہ اسے جیتا نگل لیں۔ اور جو ذرا بہت ہیڈ ماسٹر کے داب سے پڑھ لیتے ہیں وہ بھی بند کر دیں اور لڑکوں کا خیال آتے ہی کیسا بھی مست کن خواب ہو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا۔ وہ لڑکوں کو کوستا۔ کاش ان سب کی مائیں بانجھ ہوتیں۔ یا بچپن میں بیوہ ہو جاتیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ بیواؤں کی شادی پر کیوں مصر ہیں۔ اگر چند مشینیں اتنی تیزی سے کام نہ کرتیں تو آج کو ایک ایک کلاس میں تین تین سکشن نہ ہوتے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر دنیا میں اتنے ننگے بھوکے کیوں ہوں کہ سڑک پر چلو تو کندھے سوج جائیں۔ ریل میں سوار ہو تو اکڑوں سوؤ۔ سنیما میں جاؤ سانس نہ لی جائے۔

مگر ابھی تو کافی وقت ہوتا اور وہ کروٹ بدل کر پھر اسی دنیا میں ڈوب جاتا۔ لیکن کروٹ کے ساتھ اس کی دنیا بھی کروٹ لیتی۔ سامنے ٹنگی ہوئی تصویر پر اس کی نگاہ جم جاتی یہ تصویر ٹیگور کی تھی، جو اس کی بہن نے شادی ہونے سے پہلے لگائی تھی اور اب اس کے جانے کے بعد بھی ویسی ہی ٹنگی ہوئی تھی۔ وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ٹیگور کی نظمیں پڑھ پڑھ کر وہ بالکل اس پر دیوانی ہو گئی تھی، وہ کس طرح ان کی پوجا کیا کرتی تھی، اس نے انھیں اپنا دیوتا مان رکھا تھا۔ اوہ۔ کاش وہ بھی کوئی شاعر یا مضمون نگار ہوتا تب، تب تو ضرور کوئی اس کی بھی اس طرح پوجا کرتا۔ وہ تھوڑی

دیر میں سچ مچ خود کو ٹیگور یا اور کوئی بڑا اور مشہور شاعر سمجھنے لگتا۔ ہر لڑکی کے کمرے میں
اسے اپنی تصویر لٹکتی نظر آتی جس میں ڈاڑھی نہ ہوتی، مگر آنکھیں اس کی اپنی آنکھوں سے
آٹھ گنی خوبصورت اور بڑی ہوتیں۔ خمدار، سیاہ کاکلیں۔ مرمریں گردن پر رقص کرتیں۔
اور پیشانی ہیرے کی طرح دمکتی۔ افسوس اس کی اپنی گردن کھردری اور دھوپ سے
جلی ہوئی تھی اور قبل از وقت بال جھڑنے پر آمادہ تھے۔ مگر کوئی پروا نہیں، خواب
میں ان باتوں کا جھگڑا نہیں ہوتا۔ بس تو ہزاروں لڑکیاں جو لازمی طور پر حسین اور
جوان ہوتیں اس پر مرجاتیں۔ پلندے کے پلندے ڈاک سے خطوں کے آتے۔ کمرہ
پھولوں کے تحفوں سے بھر جاتا۔ اور وہ ان کے عشق سے تنگ آجاتا مگر ان میں سے
سب سے زیادہ حسین، امیر اور جوان اس کا کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی، وہ تو اس پر
جان فدا کرتی۔ اور وہ کھنچتا، وہ لپٹتی یہ بھاگتا، وہ ندیدی بلی کی طرح اس کے چاروں طرف
گھومتی، پر وہ گیانی سادھو کی طرح اسے دھتکارتا۔ وہ اس کی یاد میں تڑپتی یہ اسے بھول
جاتا اس کے ماں باپ، بہن بھائی، کنبے رشتہ والے اسے لعنت ملامت کرتے۔ مگر وہ
سب کچھ تج کر اسی سے چمٹتی . . . . .

"پران ناتھ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دو۔"

"دنیا کیا کہے گی۔"

"میری دنیا تو تم ہو۔"

اس کا دل پگھلتا جاتا۔ اوہ . . . . . مگر عین اسی وقت دھوبن دروازہ کوٹتی دھوبن!
سنہرے مکھڑے والی لچکتی ہوئی . . . . . وہ اپنے گوگھاٹ پر پاتا۔ چھوا چھو رنگیلی دھوبن
چندریاں دھوتی ہوتی . . . . اس کی کنول جیسی آنکھیں پریم ساگر میں ڈوب لیتیں۔ اس
کا دل کلبلانے لگتا۔ جیسے کوئی آساوری گا رہا ہو اور گاتے گاتے کومل رے لگا دے۔
اور یکایک دھوبن کے گھر والوں سے لڑنے کی گرج سنائی دیتی ہے۔ بجائے سریلی

دھوبن کے اس کی بھینگی ساس، جب بہت سے کپڑے کھو جاتے ہیں تو ہمیشہ یہی بھینگی ساس کپڑے لے کر آتی ہے تاکہ کوئی اس سے کپڑوں کے کھونے پر باز پرس کرے تو خوب ڈنگا مچائے دام کاٹنے نہ دے۔ بلکہ اتنا لڑے کہ سارا گھر پست ہو کر پاگل ہو جائے۔ اس نے آنکھیں میچ لیں اور لزر اٹھا کہ اب دو چار گھنٹے دھوبن کے معرکے میں گئے۔

جب وہ شاعر پرست لڑکیوں سے گھبرا اٹھتا تو اسے ارمان ہوتا کہ کاش کسی کا کوئی حادثہ ہی ہو یا موٹر لڑے، یا طوفان آئے، اندھیری رات میں وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر کسی امیر اور حسین لڑکی کو موت کے پنجوں سے بچائے۔ لڑکی تو خیر شرما کر آنچل ڈھلکائے گا امیر آدمی (جس کے کوئی دوسری اولاد نہ ہونا چاہئے) اسے موٹر میں لے جائے، اور تخیل میں وہ موٹر کی سرسراہٹ سنتا اور پہلو میں حسین لڑکی کا نپنا محسوس کرتا، ایک عالیشان کوٹھی کے رئیسانہ ڈرائنگ روم میں اس کا شکریہ ادا کر کے چھوڑ کر چلا جاتا۔ پر وہ لڑکی کو چھوڑ کر جاتا اور خود فوراً یا تو ضروری کام میں لگ جاتا یا فوراً بیمار پڑ جاتا۔

اب وہ حسین لڑکی اسے پر تکلف چائے پیش کرتی اور شرمائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی تو اس کی ہستی کے تار جھنجھنا اٹھتے۔ سادھو کی لڑکی اس وقت اسے اس قدر بھدی لگتی کہ کیا بتائے۔ اسے اپنے اس قدر فرسودہ خیال ہونے کا یقین ہی نہ آتا کہ وہ ایک جنگلی لڑکی سے محبت کر سکتا تھا۔ سادھو والی لڑکی اسے پھوہڑ اور سڑیلی سی معلوم ہوتی۔ دودھ لٹیا میں لئے چلی آرہی ہے۔ پیاس لگی ہو تو چائے پلانی چاہئے، نہ کہ نکھر اچھلا نلہ بکریوں کا دودھ کرا لگائی آجائے۔ اور لٹیا سے کوئی دودھ پئے تو کیسے پئے۔ سارا باچھوں میں سے بہ جاتا ہے۔ چائے سے اس کا دماغ کھل گیا۔

اب محبت نہ ہوتی تو امیر آدمی کی لڑکی ہی کیوں پیدا ہوتی۔ لہذا وہ تو ہوئی ہی، اب دو باتیں ہوتیں۔ یا تو امیر آدمی فوراً اسے گھر داماد بنا لیتا اور دونوں ہنسی خوشی رہنے سہنے لگتے۔ یا اگر کوئی جناتی بڈھا ہوتا تو اودھم مچاتا۔ بڈھے کے اودھم مچانے کے خیال سے

ہی اس کے خواب پھسلنا شروع ہو جاتے۔ اور سب تتر بتر ہو جاتے۔ اسے یاد آجاتا کہ شادی وادی اس کی کچھ نہیں ہو رہی ہے بلکہ شام کو اسے ڈبل ڈیوٹی بجانے پھر اسکول جانا ہے۔

وہ امتحان دیتے ہوئے لڑکوں کی قطار میں اِدھر سے ادھر اور ادھر سے اِدھر گھڑی کے پینڈلم کی طرح گھومتا۔ لڑکے سر جھکائے کاغذ گودنے میں تندہی سے جتے ہوئے، گویا بڑا اہم کام کر رہے ہیں۔ مگر وہ خوب جانتا ہے کہ امتحان دینے کے بعد یہ لڑکے بھی اسی طرح گھڑی کے زنگیائے پرزوں کی طرح ایڑیاں رگڑیں گے۔ کاغذ کتنا مہنگا ہوتا جا رہا ہے اگر سوچ سمجھ کر کام کیا جائے تو...... خیر اس میں اس کا کیا دخل تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ پھر اونگھ جاتا...... اس کا دماغ سو یا کرتا۔ مگر ٹانگیں برابر آگے پیچھے کھسکتی رہتیں۔ گھر پہ جو بڈھے امیر سے وہ لڑائی کو ادھ بیچ میں چھوڑ آیا تھا اسے پھر جوڑ توڑ کر شروع کرتا۔ لیکن اس کنجوس خبیث سے لڑنا اسے قطعی نہ بھاتا اور وہ فوراً ہی رخ بدل کر کوئی دوسری ترکیب سوچنے لگتا۔ اس مرتبہ اس کے خوابوں کی رانی کبھی تو ریل کے کمپارٹمنٹ میں سب مسافروں کے چلے جانے کے بعد مسکرا مسکرا کر ایک نیا قصہ شروع کر دیتی یا سڑک کے نکڑ پر سنسان گلی میں اس کی سائیکل سے ٹکرا جاتی۔ یا اپنے شاندار موٹر سے اسے کچل کر گھر اٹھا لے جاتی۔ یا کبھی ایسا بھی ہوتا وہ بیہوش ہو کر اس کی آغوش میں آن پڑتی اور پھر؟..... پھر وہی بات۔

وہ جہاں جاتا..... جدھر دیکھتا ایک نہ ایک لڑکی ضرور اس کے کام میں ٹانگ اڑا دیتی۔ جھلا اٹھتا، بھن جاتا، آخر یہ ذلیل کمینی، بیوقوف ہستی، شیطان کی طرح اس کے پیچھے کیوں لگی ہوئی تھی۔ دنیا کے ہر معاملہ میں گھسی پڑتی ہے اور خواہ مخواہ ادھم مچاتی ہے۔ کمبخت کو چار دیواری میں بند کر دو، بیڑیاں ڈالو، پر چھلاوے کی طرح ہر جگہ موجود.... اوہ مگر کہاں؟ موجود تو تھیں مگر اس سے کتنی دور! اماں نے کتنی ہی لڑکیاں ڈھونڈیں پر

سب چڑیلیں، بھونڈی، چپٹی، نکٹی، خاندان بھر میں ایک بھی ڈھنگ کی نہ تھی۔ ہندوستان میں سیاہ رنگت نے تو اور بھی لٹیا ڈبو دی۔ ادھر کے ملکوں میں بلا کی رنگت تو ہے۔ یہ نہیں کہ کالی کالی چھپکلیاں سی۔ دیکھو تو دل لوٹ جائے۔ اس کے خیالات فوراً بدل جاتے۔ اور اسے سادھوں کی لڑکی کے چہرے پر گہرے گہرے داغ دکھائی دینے لگتے۔ وہ امتحان دیتے ہوئے لڑکوں کی شکلیں گھورتا۔ اندازاً سب کی بہنیں اسے بھونڈی نظر آتیں۔ کمبخت کیا بری شکلوں کے تھے۔ بنواری کی ناک پر تو جی چاہتا گھونسا مار دے۔ خصوصاً جب وہ جومیٹری سمجھاتے وقت اپنا پورا دھیان کھڑکی سے باہر خوش مذاق کتوں کی طرف لگا دیتا۔ دھنیو کمبخت بھینگا، بھنویں تکونی ـــــ دانت سڑے ہوئے۔ سروپ کے تو خیال ہی سے وہ جل اٹھتا۔ لوگ کہتے ہیں بچوں کو پیار سے پڑھاؤ چاہے جی چاہتا ہو کہ سب کو زندہ جلا دیں۔ مگر پیار کر دیا جا رہا ہے۔ خوب! اچھی ہو جالو۔

کونے میں بیٹھی ہوئی مرہٹی لڑکی کو دیکھ کر وہ اور بھی تنگ ہوتا۔ اس کے نخرے ہی نرالے۔ زیادہ سے زیادہ بارہ یا چودہ برس کی۔ پر وہ کلاس میں ایسی رکھی جاتی تھی جیسے روئی کا پھویا۔ الگ ایک کونے میں اینٹھی ہوئی۔ غرور سے بیٹھ اکڑائے ڈٹی رہتی۔ یہ فتنی نہ جانے کتنے دل جلوں کو ہیڈ ماسٹر صاحب سے ٹھکوا چکی تھی۔ ذرا کوئی بولا اور انڈوں پر بیٹھی مرغی کی طرح کڑکڑاتی۔ خود وہ ماسٹر ہو کر اس سے ڈرتا تھا۔ اور ویسے اس میں دھرا کیا تھا۔ ذرا سی چھوکری کون منہ لگے۔ مگر جب بھی اس کی طرف دیکھو معلوم ہوتا کہہ رہی ہے "کہہ دوں ہیڈ ماسٹر صاحب سے ہا"۔ کبھی وہ اسکول میں کام کر کے نہ لاتی تو کیا مجال جو کوئی اس سے پوچھ سکے کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ وہ نخریہ بھول جانے کا عذر کر کے صاف بچ جاتی۔ اس کا دل چاہتا ایک کوڑا لے کر مردار کو اتنا مارے کہ بیہوش کر دے، اور جو کچھ بولے تو مرغا بنا کر سب سے موٹے لڑکے کو اس کی پیٹھ پر چڑھا دے۔

یہ عورت ... عورت ... عورت منحوس، چڑیل، دیوی کتیا ... دل کی رانی ....

ڈائن، شکر ہے کہ چھٹی ہو گئی اور خواب ختم ہوا۔

آخر وہ شادی کیوں نہیں کر لیتا؟ مہا بیوقوف! ماں کہتی ہے۔

"کوئی اچھی لڑکی نہیں ملتی"۔

لڑکی اچھی بری؟ لڑکی لڑکی ہوتی ہے۔ نہ کہ اچھی بری اور اسے ساری لڑکیاں ایک ہی جیسی معلوم ہوتیں۔ جیسے پختہ اینٹیں ...... سب کی سب چالاک، کاہل، منحوس، اترانے والی۔ لڑکیاں نہیں ملتیں؟ اور یہ جو بھر بھر لاری اسکولوں کو جاتی ہیں وہ کیا بکریاں ہیں؟۔ اسکولوں کی لاری میں فوراً ایک نئی جاذبیت پیدا ہو جاتی۔ چھٹی کلاس میں جب سے اسے مہترانی کی بہو کی کمر لچکتی نظر آتی تھی اس کے لیے لاری ایک اڑن کھٹولا بن گئی تھی۔ جس پر پریاں لد لد کر شہر کے گناہ گاروں کا دل للچانے، گلی کوچوں میں سرگشت اڑاتی تھیں۔ اب بھی وہ جب لاری کا ہارن سنتا تو سوئے ہوئے دل کے سارے بھوت پریت جاگ اٹھتے۔ جلدی جلدی پر مار کر لاری کے پاس پہنچ کر اپنی بھوکی آنکھیں لڑکیوں کے جسموں پر چبھو دیتا ...... مگر ......

دور سے لاری میں لڑکیاں ہی لڑکیاں بھری ہوئی بالکل حوریں معلوم ہوتیں پر جب قریب آکر غور سے دیکھتا تو مرجھائے ہوئے کالے، کھردے، چوکھونٹے، بھکونے، چہرے رنگ برنگے چیتھڑوں میں الجھے ہوئے ایسے معلوم ہوتے جیسے خزاں آنے پر چند ڈھیٹ کیتھے کے پھل ڈالیوں پر لٹکے رہ جاتے ہیں۔ وہ آپس میں کچ کچ مرغیوں کی طرح لڑتیں اور کوئی بھی تو ان میں سے اپنا حسین معصوم بھولا چہرہ مسکرا کر باہر نہ نکالتی۔ کسی کی بھی تو نرگس جیسی آنکھیں نہ ہوتیں۔ چمیلی کی کلیوں کی طرح نازک اور پتلی انگلیوں کی بجائے گھسے ہوئے چپٹے ناخونوں والی ٹھنگنی انگلیاں۔ سیٹی کے کانٹوں کی طرح جھولتی ہوئی لٹیں، میلی ناکیں اور الجھی ہوئی چٹیاں، اس کا رومان ٹوٹ کر چور چور ہو جاتا۔ وہ پکا ارادہ کر لیتا کہ اس غلیظ جنس سے اب وہ کوئی واسطہ نہیں رکھے گا۔ بدبخت ....

اس کے خیال تیرنے لگتے...... جب وہ نویں میں پڑھتا تھا تو آٹھویں میں کیسا نازک نازک سا ایک لڑکا پڑھنے آیا کرتا تھا..... مگر اس کے ساتھ اسے چند ناگوار واقعات یاد آگئے۔ اور وہ بھڑک گیا۔

ٹنن ٹنن۔ کوئی کالج کی لڑکی سائیکل اڑاتی آرہی تھی۔ خواب پھر بدلے۔ کیا عجب سائیکلیں ٹکرائیں۔ جیسے ستارے ٹکراتے ہیں ـــــ اور پھر طوفان..... گرج اور چمک..... بیہوش حسینہ..... مگر..... وہ بریک..... بریک..... لگا ہی نہیں ایک ستارا کاوا دے کر نکل گیا ـــــ ایک گرا دھم سے۔ گھٹنوں پر سے پیجامہ مسک گیا، گٹے چھل گئے۔ دوسرے ستارے کی ساری دور موڑ پر ہوا میں لہرائی اور گم۔

کاش اس کا بس چلتا! اس کا بس چلتا تو وہ بتاتا۔ منحوس لڑکی۔ بڑی علم حاصل کر رہی ہیں۔ کچھ نہیں، کچھ پڑھنے ورھنے کی ضرورت نہیں...... جنگلی..... ان سے سادھو کی لڑکی ہی ہزار بلکہ کروڑ درجہ اچھی تھی۔ دودھ تازہ۔ چمکتی ہوئی پیتل کی لٹیا میں باچھوں میں بہ رہا ہے۔ اس سے تو وہ سڑک کوٹنے والی ہی اچھی، اگو اس کی کھال جھلس کر سائیکل کی گدی سے ملنے لگتی ہے۔ اور پنڈلیاں پھوڑوں سے لدی ہوئی ہیں۔ اور دو منٹ ساتھ بیٹھ جاؤ تو جوئیں بلبلانے لگیں۔ مگر ذرا آنکھ جھپکاؤ مسکراہٹ کی بجلیاں تیار۔

وہ سائیکل والی لڑکی کے لئے نئے نئے کوسنے تراشتا ہوا چلتا۔ ٹانگ ٹوٹ جائے۔ چھوڑ کر چلا جائے کوئی اسے۔ کاش اس کے ناجائز بچہ ہو اور کالج سے نکالی جائے۔

وہ عورتوں کی طرح کوسنے لگتا۔ کالج میں پڑھنے والیوں کو یہی کوسنے دیتے ہیں۔

اور خواب اور خواب اکالے کالے بھوتوں کی طرح دانت نکال کر تھرکتے۔

حادثے۔ جنگل۔ سادھو اور اس کی لڑکی۔ ڈرائنگ روم۔ سڑک، لاری، شادی بیاہ، سب گڈمڈ ہو کر ایک دوسرے سے الجھ جاتے اور سب کے سب سیاہ بادلوں کی طرح اس کی ہستی پر امنڈ کر گرجنے لگتے۔ اور پھر ـــــ

○

لوگ کہتے ہیں اسے "دماغی بخار" کی شکایت ہے ـــــ میں سوچتی ہوں شاید
یہ بھی اس کا ایک خواب ہے۔

جنازے

میرا سر گھوم رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کاش ہٹلر آجائے اور اپنے آتشیں گولوں سے
اس نامراد زمین کا کلیجہ پھاڑ دے۔ جس میں ناپاک انسان کی ہستی بھسم ہوجائے۔ ساری دنیا
جیسے مجھے ہی چھیڑنے پر تل گئی ہے۔ میں جو پودا لگاؤں مجال ہے کہ اسے مرغیوں کے بے درد
پنجے کریدنے سے چھوڑ دیں۔ میں جو پھول چنوں بھلا کیوں نہ وہ میری سہیلیوں کو بھائے۔
اور وہ کیوں نہ اسے اپنے جوڑے کی زینت بنالیں۔ غرض میرے ہر فعل اور قول سے دنیا کو
بیر ہوگیا ہے۔ اور میری دنیا بھی کتنی ہے۔ یہی چند بھولے بھٹکے دوست۔ دو چار سکنڈ ہینڈ
عاشق مزاج اور کچھ پھوہڑ، لڑاکا، اور فیشن پر مرنے والی سہیلیاں۔ یہ بھی کوئی دنیا ہے ؟
بالکل تھکی ہوئی دنیا۔ میرے تخیلات سے کتنی نیچی اور دور۔ اور اب تو اس دنیا میں اور بھی دھول
اڑنے لگی۔ معلوم ہوتا ہے میں قبل از وقت پیدا ہوگئی ہوں۔ تغلق جسے دنیا دیوانہ کہتی تھی، وہ
بھی اپنے وقت سے پہلے آیا تو حواس باختہ ہوگیا۔ پھر میں کیا چیز ہوں ؟ لیکن ایک زمانہ
ہوگا جب دنیا میری ہم خیال ہوجائے گی۔ لوگ میری سنیں گے۔ اور کشور ؟ کشور کے واقعہ
نے تو مجھے بالکل نیم مردہ کر دیا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ میری چیخ پکار! یہ پھڑکتا ہوا دل، جس
میں انسانی ہمدردی اور اخوت کا سمندر لہریں مار رہا ہے۔ جس کے خواب ملک کی بہتری

کے نذر ہو چکے ہیں۔ جس کے جذبات، مذہب اور انسانیت میں غرق ہیں۔ یہ سب کچھ بے کار بالکل بیکار۔ بیل گاڑی کی چوں چوں اور مریل گھوڑے کی ٹاپوں میں بھی تو اس سے زیادہ اثر ہے۔

"یہ بھی کوئی دنیا ہے، یہ بھی کوئی دنیا ہے۔" میں کرسی پر جھوم رہی تھی۔

"کس کی دنیا؟ میری؟" راحت اندر آکر تخت پر بیٹھ گئی۔

راحت ——— ؟ آپ نے چند موم کی پتلیوں کو تو دیکھا ہوگا۔ ننھی، منی کھیل کود کی شوقین جن کا مقصدِ زندگی کھیلنا ہے۔ گڑیوں سے کھیلنا، کتابوں سے کھیلنا۔ اماں ابا سے کھیلنا۔ اور پھر عاشقوں کی پوری کی پوری ٹیم سے کبڈی کھیلنا۔ ابھی میرے بدنصیب بھائی کے ساتھ ٹینس کھیل کر آ رہی تھی۔

"تمہاری دنیا؟ راحت تمہاری دنیا تو ٹینس کے کورٹ پر ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"کون.... میری؟ تمہارا مطلب ہے ضمیر؟ توبہ کرو۔ وہ تو تمہارا بھائی ہے، پر ہے چغد، معاف کرنا۔ اللہ کی قسم ایسے ہاتھ چلاتا ہے جیسے ٹینس کے بجائے فٹ بال کھیل رہا ہے۔ اور پھر مزہ یہ ہے کہ اگر جناب کے ساتھ نہ کھیلو تو.... یہ کہ.... بس"۔

یہ میرے بھائی صاحب کی شان میں میرے منھ پر فرمایا جا رہا تھا۔ اگر میں بھی شہنشاہ اکبر کی طرح طاقت ور ہوتی تو اس بے ایمان چھوکری کو انار کلی کی طرح دیوار میں زندہ چنوا دیتی، یہ پرفن لڑکیاں بیوقوف لڑکوں کو خون کے آنسو رلواتی ہیں اور موت کی ہنسی ہنسواتی ہیں۔ اور پھر چٹ کہیں اور کسی کی ہو رہتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ضمیر الو ہے اور رہے گا۔ گیا جناب کی تھرڈ کلاس پسند ہے۔ وہ لڑکی جس میں نہ قوم کی ترقی کا جوش، نہ قربانی کا جذبہ، نہ ملک کا پیار، جو بی۔ اے کرنے کے بعد بھی نہ مرد کی اصلی فطرت کو سمجھی اور نہ عورت کے جذبات سے واقف۔

"مگر آپ کو اس کی اتنی دلداری کیوں منظور ہے۔ آپ دوسروں سے کھیلیں، دیکھیں کون آپ کو روک سکتا۔"

"بھئی واہ۔ روکے گا کون۔ پر اچھا نہیں لگتا۔ وہ..... مجھے بچارے پر رحم آتا ہے۔ دوسر....."

"خوب رحم آتا ہے۔ اسے جیسے..... جیسے دوسری کوئی نصیب نہ ہو گی۔ میرا خون کھول گیا۔

"اسے لوٹے گی کیوں نہیں..... یہ میں کب کہتی ہوں..... مل جائے گی۔ مل ہی جائے گی"۔ راحت ہکلانے لگی۔

"مل ہی کیا جائے گی۔ اسے کمی نہیں۔ یہ تو..... وہ بیوقوف ہے"۔

"ہاں —— یہ بات ہے جبھی تو میں کہتی ہوں"۔ راحت خوشی سے چہکی۔

"جبھی تو کیا.....؟" میں نے جل کر پوچھا۔

"اے بھئی یہی کہ..... بھئی مجھے نہیں۔ تمھیں معلوم ہے کہ مجھ میں تمھاری جیسی عقل نہیں اور نہ مجھ سے بحث کی جائے۔ تمھیں یاد ہے کہ میں تو کوئی..... بالکل..... بھئی کبھی بحث کر ہی نہ سکی۔ یہی تو بات ہے کہ ضمیر....."۔

"ہاں کیا ضمیر؟" میں نے اس کی شکست سے خوش ہو کر کہا۔

"یہی..... یہ مجھے ضمیر پر..... یہی کہ بس خیال آتا ہے کہ وہ بچارا"۔

"اوہو تم کتنے فخر سے اسے بچارا کہتی ہو"۔ میرا منہ کڑوا ہو گیا۔

"آج تو تم بے طرح بگڑ رہی ہو کیا ہوا —— کیا سعید نے ڈانٹا۔ ابھی سے اینٹھتا ہے"۔

سعید کے نام سے میرے بدن میں پتنگے لگنے لگتے ہیں۔ آپ ایک اور راحت جیسی روح رکھنے والے انسان ہیں۔ آپ نے کمال فرمایا کہ ایک دفعہ مجھ پر عنایت کی۔ کمال۔

میرے جواب سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ پہلے تو ذرا متعجب ہوئے۔ پھر خوب متعجب ہوئے۔ اور پھر اور زیادہ ہوئے۔ بعد میں سنا تھا اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوئے۔ ضمیر سے بولے کہ "میں انھیں غلط سمجھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ان پر ترس آیا تھا۔" خدا جانے یہ انھیں مجھ پر ترس کھانے کا کیا حق تھا۔ اور کیسا ترس؟ یہ مجھ پر آج تک واضح نہیں ہوا۔

لیجئے اتنا لمبا قصہ سعید کا ہی ہو گیا۔ وہ تو میں نے کہا نا کہ میں تو بات بھی کروں تو اس کو بھی تو گڑبڑا دیتے ہیں یہ دنیا والے!

"ہونہہ سعید کی ہمت۔ وہ ہیں کیا چیز؟ اگر سعید ذرا بھی کچھ ہوتے تو مجھے یہ الفاظ کیوں استعمال کرنا پڑتے؟"

"اتنا چوڑا، چکلا اور اونچا انسان اور تم "کچھ" کہتی ہو۔

"انسان کی بڑائی چوڑے چکلے ہونے سے نہیں ہوتی۔ عقل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اونہہ! آخر عقل مند ہونے کی ایسی گیا مار ہے اور عقل مند میاں میں ایسے کیا لعل جڑے ہوتے ہیں۔ بیکار میں رعب گانٹھتا ہے۔ اور پھر تمھیں کہتی ہو کہ مردوں کی حکومت نہ سہنی چاہئے۔ میرے خیال میں ضمیر ۔ ۔ ۔ بھئی نہ میاں ضرورت سے زیادہ عقلمند ہوگا نہ ہم کو دبایا جائے گا۔"

"تم میں کاش ذرا سوچنے کی بھی ہمت ہوتی۔ بحث کرنے لگتی ہو۔ مگر ۔ ۔ ۔ خیر یہ اس وقت مسعود کا کیا ذکر۔ میں تو کشور کو کہہ رہی ہوں۔"

"کون کشور؟"

"روفی والی۔"

"کون روفی؟"

"اللہ! اتنا بننا!"

"اونہہ تو گویا میں تمہاری کشوروں اور روفیوں کے رجسٹر لیے ان کی مثنوی لکھا کرتی ہوں۔ تمہارا مطلب کشور سے ہے —— وہ رونی کشور؟"

"جی وہی۔ روئے نہ تو غریب کیا کرے۔ ہم عورتیں تو رونے ہی کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔" یہ چند آخری الفاظ میں نے خود سے کہے اور ٹھنڈا سانس نہ روک سکی۔

"ہاں رونے سے آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ سارا گرد و غبار...."

"اور تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ جاؤ راحت میں اس وقت تمہاری بدمذاقی سہنے کے لائق نہیں۔ جاؤ ٹینس کھیلو۔"

"ہوں۔ ٹینس کھیلو، جیسے تمہارے بھیا کو آتی بھی ٹینس ہے —— میں تو آئی کہ چلو بھئی ہو آئیں ذرا۔ آپ ہیں کہ...." راحت برا مان گئی۔

"تو تم سمجھتی ہو میں بڑی خوش بیٹھی ہوں کہ تم مجھے آ کر جلاؤ۔ ایک تو تم بار بار ضمیر کو برا بھلا کہے جا رہی ہو۔ آج میں ویسے ہی پریشان ہوں۔ کشور سے ملی تھی تمھیں کیوں یاد ہو گی کشور؟ تم کوئی اس کی مثنوی تھوڑی ہی لکھ رہی ہو۔"

"ہاں ہاں پھر کیا ہوا!"

"اس کی شادی ہو رہی ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے طوفان کو دبایا۔ کئی دن سے دبا رہی تھی۔

"اچھا کب؟"

راحت کو کشور کے دکھ سے سکھ نہ پہنچے گا تو کسے پہنچے گا؟ کشور ٹھہری میری دوست اور میں ضمیر کی بہن۔ اور ضمیر، راحت کے زبردستی کے عاشق۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ آج میں ہوں اور ضمیر۔ سوئر کہیں کا!۔

"کیا اسی مرگھلے سے تو نہیں ہو رہی ہے۔" راحت ڈر گئی۔

یہ مرگھلا رونی کو کہا جا رہا تھا۔ اور کیوں؟ وہ اس لئے کہ راحت اس کے اشعار

سے نفرت کرتی تھی۔ کیوں؟ کیونکہ بس تھی۔ فرماتی تھیں "بہت ڈھیلے شعر کہتا ہے"۔ اب شعروں میں نہ جانے ڈھیلے اور تنگ کیسے ہوتے ہیں؟"

"تم اسے مرگھلا کہتی ہو۔ لیکن کشور کے دل سے پوچھو"۔

"کشور تو سدا کی سٹرن ہے"۔

"بس راحت زیادہ بنو مت۔ تم سے زیادہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اے ہے معاف کرو، باز آئی میں تمھاری کشور کے قصہ سے، ختم بھی کرو"۔ راحت منھ بنا کر ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ گئی۔

"تمھیں معلوم ہے کہ وہ مر جائے گی۔ مگر رونی کے سوا کسی سے شادی نہ کرے گی۔ اور اماں کہتی ہیں کہ میں تو شوکت سے کروں گی"۔

"اے ہے بڑھیا شادی کر رہی ہے"۔ راحت چونک کر اٹھی "تمھیں خدا کی قسم"۔

"اونہہ، اونہہ۔ جیسے کچھ اترانے میں بھی مزہ ہے۔ کشور کی شادی کا ذکر ہے اور بننے لگیں ــــــ"

"ارے ۔ ۔ ۔ ۔ میں سمجھی ۔ ۔ ۔ ۔ خیر ۔ ۔ ۔ ۔ پھر؟"

"کشور کہتی ہے کہ زہر کھا لوں گی۔ مگر رونی کے سوا ۔ ۔ ۔ ۔" باوجود ضبط کے میرا گلا گھٹ گیا۔

"ارے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر کون سا زہر کھائے گی؟ میرے خیال میں سائنائیڈ ٹھیک رہے گا"۔

"راحت۔ پتھر کا کلیجہ اور لوہے کا دل اسی کو کہتے ہیں۔ ساتھ کھیلے، ساتھ پڑھے، ساتھ اسکول گئے اور پھر کالج۔ مگر اس بے حس گوشت کے لوتھڑے کو ۔ ۔ ۔ ۔" اُفوہ میرا خون پھر کھول گیا۔

"چپ رہو بے رحم! کاش بجائے انسان کے خدا تمھیں ایک چٹان بناتا جس

پر۔ جس پر۔۔۔۔" مجھے کوئی پر معنی لفظ ہی نہ ملا۔" تمھاری بے رخی دوسروں کو دکھ نہ پہنچاتی۔ ذرا سوچو بے قصور کشور نے تمھارے ساتھ کیا بدی کی ہے؟ اس نے تمھیں کیا دکھ پہنچایا۔ وہ جو ایک معصوم چڑیا سے بھی معصوم ہے۔ وہ جس نے سر جھکا کر دنیا کے دکھ سہہ لئے اور سہہ رہی ہے۔ وہ جسے اس کی ظالم ماں دولت اور شہرت کی بھینٹ چڑھا رہی ہے۔ جو سر لٹکائے راضی بہ رضا قربان گاہ کی طرف جا رہی ہے"۔ میری زبان کے ساتھ ساتھ عمدہ عمدہ جملے تیزی سے چل رہے تھے۔" جس نے قصائی کے سامنے گردن ڈال دی ہے۔ اور خاموش اس کی چھری کی دھار دیکھ کر اپنا ہی خون جلا رہی ہے۔ تم بھی اسے دو باتیں کہہ لو۔ مگر دور ہو جاؤ میری آنکھوں سے، جاؤ راحت"۔

"اے ہے توبہ۔۔۔۔ ماشاء اللہ تم بڑی بدمزاج ہو ـــــ" راحت ڈر کر سکڑ گئی"۔

"ایسا میں نے کیا کہہ دیا؟"

"تم نے کیا کہا؟ اور اوپر سے یہ بھی پوچھنے کی ہمت ہے؟ ـــــ تم اس کی موت پر ہنس رہی ہو۔ اس کا خون ہو رہا ہے، تم ہنس رہی ہو۔ وہ مرغ بسمل ہو رہی ہے۔ اور تم ہنس رہی ہو ـــــ اس کی لاش ـــــ ہاں اس کی لاش پر تم دانت نکال رہی ہو"۔ مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا سوائے ایک معصوم کے جنازے کے۔

"اوہ۔۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اللہ کا واسطہ چپ ہو جاؤ۔ ابھی ذرا بجلی جلا دو مجھے ڈر لگ رہا ہے"۔ راحت پیلی پڑ گئی۔

"تم سمجھتی ہو کہ تمھارے اوپر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ تم ہنستی ہی رہو گی، اس کی موت پر ـــــ مگر یاد رکھو راحت، کشور تمھیں نہیں چھوڑے گی۔ وہ مر جائے گی مگر کیا تم سے سوال نہ کرے گی۔ اس کی روح۔۔۔۔"

"ہائے۔ بجلی جلاؤں میں۔۔۔۔۔ اچھی بہن میرا دم نکل جائے گا"۔ راحت بزدلوں

کی طرح چلائی اور جلدی سے اپنے پیر تخت کے اوپر رکھ لیے۔ گویا تخت کے نیچے سے کشور کی روح ابھی سے اس کے پیر کھینچ رہی تھی۔

"تم اس کو بچاؤ ــــ بچاؤ گی۔ تم اس کی مدد کرو گی"۔ میں نے ایک مسمریزم کا تماشا کرنے والے کی طرح کہا۔

"ہاں مگر بجلی ــــ" راحت کانپ رہی تھی۔ "ہاں.... اب...."

"تم اس کی ماں کو مجبور کرو گی کہ وہ اس کے قتل سے باز آئے"۔

"مگر وہ.... تو.... بہن ان کی ماں سے ڈر لگتا ہے مجھے"۔ میری آواز کی نرمی سے اس کی گئی ہوئی ہمت واپس آگئی۔

"میں اور تم اس کی ماں کو مجبور کریں گے کہ وہ کشور کو زندہ دفن نہ کرے"۔

"ہاں تم کرنا.... ریحانہ تم بہت بہادر ہو۔ تم.... تم واقعی بہت زبردست ہستی ہو۔ تم انسانیت کا بہترین مجسمہ ہو۔ ریحانہ اگر ہماری قوم میں ایسی ہی چند لڑکیاں پیدا ہو جائیں تو ہم غلام کیوں رہیں۔ اور اب تم بجلی جلا دو۔ میں زمین پر اتروں گی میرا جوتا کبھی تو نہ جانے کدھر ہے؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں ایک بھٹکے ہوئے راستہ سے واپس لوٹ رہی تھی۔

"ہم اس سے لڑیں گے، اور یہ قربانی نہ ہونے دیں گے"۔ میں نے اپنے آپ کو ایک طیارے پر سے بم گراتے محسوس کیا جن کے شعلے شوکت کو اور کشور کی ماں کو نگل رہے تھے۔

"مگر.... وہ کشور خود جو اپنی ماں سے لڑے نا۔ ایسی ننھی ہے کیا....؟"

"وہ خود لڑے؟" مجھے پھر جوش آیا۔ "وہ پڑھی لکھی ہے تو کیا ہے۔ راحت وہ مشرقی عورت ہے، وہ بے شرمی نہیں لا سکتی۔ وہ کہہ چکی ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ زبان ہلائے بغیر جان دے دے گی۔ تم جانتی ہو وہ سدا کی کمزور دل ہے"۔

"تو بہن میں کون سی پہلوان ہوں"۔ راحت اور کونے میں دبک گئی۔

"تم ہو یا نہ ہو مگر میں کروں۔ میں خود کروں گی۔ راحت اب تک میں تمھیں بے رحم ہی سمجھتی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ تم بزدل بھی ہو۔ چوہے سے ڈر جانے والی لڑکیاں! یہی تو ہماری قوم کی غلامی کی ذمہ دار ہیں"۔

"اوہو کوئی بھی نہیں"۔ شکست خوردہ آواز میں کہا گیا۔

"سچ بتاؤ کشور .... وہ میرا مطلب ہے راحت، کبھی تمھارے دل میں اپنی جنس کی بہتری کا خیال بھی آتا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچتی ہو کہ ہم کب تک ظالم مردوں کی حکومت سہیں گے۔ کب تک وہ ہمیں اپنی لونڈیاں بنائے چہار دیواری میں قید رکھیں گے۔ کب تک یونہی ہم دبے مار کھاتے رہیں گے۔ بتاؤ بولو ـــــ" مجھ پر پھر جوش سوار ہو رہا تھا۔

"سوچا کیوں نہیں .... سوچتی ہی ہوں"۔

"کیا سوچتی ہو۔ ذرا بتاؤ کیا سوچتی ہو؟"

"یہی کہ بھئی ـــــ یہی سوچا کرتی ہوں کہ اب .... اصل بات تو یہ ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں سوچتی اور بھلا سوچوں بھی کیا ....؟"

"یہی سوچو۔ یہی کہ کس طرح تم اپنی قوم اور ملک کے لئے قربانی کر سکتی ہو۔ کس طرح تم اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتی ہو۔ اٹھو راحت ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا۔ یہ تمھارا ٹینس بھلا قوم کو کیا بلندی پر لے جا سکتا ہے"۔

"بلندی؟" راحت نے خاموشی کو توڑا۔ "ریحانہ مجھے آج یقین ہو گیا کہ واقعی تم کچھ ہو۔ تم .... میں تمھیں جھکی اور کج بحث کہا کرتی تھی۔ مگر آج .... معاف کر دو، معاف کر دو مجھے۔ تم کہو میں تم .... تمھارا کہنا مانوں گی۔ بتاؤ .... میں کل ہی اپنا ریکٹ توڑ دوں گی .... کیوں توڑ دوں؟ اور میں ضمیر .... اسے بھی .... میں اب ٹینس ہی نہیں کھیلوں گی، میں اس سے شادی نہیں کرنے کی۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ اب تم

اس خیال کو چھوڑ دو اور تمہیں اب انگوٹھی کے ڈیزائن تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں"۔ راحت کے لہجہ میں رقت اور پشیمانی بھری تھی۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میں کل کشور کے پاس جاؤں گی، اور اسے یقیناً اس نکرے کے پنجے سے نجات دلاؤں گی۔ تم چلوگی . . . کیوں چلوگی نا؟"

راحت کچھ نیم مردہ اور پریشان سی چلی گئی۔ برآمدے میں میں نے اسے ضمیر کے شانے پر سر رکھے سسکیاں بھرتے دیکھا۔ نہ جانے وہ کیا بڑبڑا رہے تھے۔ "اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" وہ نہ جانے کسے کہہ رہی تھی!

رات میرے لئے لمبی اور اندھیری تھی۔ مگر دور مجھے ایک روشن ستارا نظر آرہا تھا۔ یہ میری قوت فیصلہ تھی جو میری ہمت بڑھا رہی تھی۔ میں کشور کو بچاؤں گی۔ میں ایک معصوم چڑیا کو نکرے کے خوفناک پنجوں میں سے نکال لاؤں گی۔ شوکت کو اپنی دولت کا گھمنڈ ہے، اپنی صورت پر ناز ہے اور تعلیم پر اکڑتا ہے۔ یہ سب کچھ دھرا رہ جائے گا۔

سہ پہر کو راحت اور میں کشور کے یہاں پہنچ گئے۔ اوہ، کشور کو دیکھ کر میرا دل مسل کر رہ گیا۔ وہ مجھے عجیب گھبرائی اور کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے نظر بھر کر نہ دیکھ سکتی تھی۔ شاید ان آنسوؤں کو وہ بیکار چھپانے کی کوشش کر رہی تھی جو خون بن کر اس کے رخساروں پر دمک رہے تھے۔ گو اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ ایک شنگرفی رنگ کی ساری پہنے آئینے کے سامنے جوڑے میں پنیں لگا رہی تھی۔ اسے اس بھڑکیلے لباس میں دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ ستی ہونے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مگر اب میں آگئی تھی۔ میں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ اور وہ ایک مردہ ہنسی میں ڈوب گئی۔

"ڈرتی کیوں ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

مگر وہ نظر بچا گئی اور ناخونوں کی پالش کی شیشیاں نکال کر اپنی ساری پر رکھ کر موزوں رنگ چھانٹنے لگی۔

"جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، میری قسمت —— راحت یہ ٹھیک ہے نا۔" اس نے راحت کو ایک شیشی دکھائی۔

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ تم جو چاہو گی وہی ہو گا۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ تمھاری مرضی کے بغیر تمھیں اس بے پسند کی شادی کی آگ میں جھونکے ——"

وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی اور جلدی سے ناخون رنگنا شروع کر دیئے۔

"تم ڈرتی کس سے ہو۔" وہ اور بھی گھبرائی۔"میری بات سنو کشور. . . ."

"چھوڑو ریحانہ ان باتوں کو۔ ہاں یہ تو بتاؤ وہ تمھاری کتاب . . . ."

"میری کتاب تو ڈالو چولہے میں۔ اور تم یہ بتاؤ آخر تمھاری والدہ . . . ."

"جانے بھی دو۔" اس نے جلدی سے بات کاٹی۔"ہاں راحت وہ تمھارے ٹینس کا کیا حال ہے۔" اس نے میرے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹینس . . . . ٹینس . . . . تم . . . . وہ اب . . . . خیر بتاؤ شوکت کہاں ہیں۔" راحت نے پوچھا اور کشور کا رنگ تمتما اٹھا۔

"ہاں وہ شوکت صاحب کہاں ہیں، ذرا مجھے ان سے بھی دو دو باتیں کرنی ہیں . . . . بے رحم انسان . . . . اگر انسان کہلانے کے . . . ."

"ہٹاؤ بھی ریحانہ، جو میری قسمت میں لکھا تھا۔" وہ ڈر کر اور گھبرائی۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ کشور کسی سے ڈر رہی تھی۔ گھبرا گھبرا کر وہ برابر والے کمرے کی طرف ایسے دیکھتی تھی گویا اب کوئی شیر اس میں سے نکل کر اسے پھاڑ کھائے گا۔ شوکت میرا جی چاہا اسے . . . . اسے نہ جانے کیا کر دوں۔ ایک معصوم لڑکی کے دل میں اس نے نہ جانے کیا دہشت بٹھا دی تھی کہ وہ اس کے ذکر ہی سے گھبرا جاتی تھی۔ میرا ارادہ اور بھی مستقل ہو گیا فولاد کی سی سختی آ گئی۔ میں نہ صرف کشور ہی کو بچاؤں گی۔ بلکہ میرا ہاتھ دور دور پہنچ کر ہزاروں بیکس لڑکیوں کو پناہ کے احاطہ میں لے لے گا۔ راحت کی طرح

ساری کی ساری لڑکیاں قوم کی داسیاں بن جائیں گی اور پھر —— پھر ہندوستان آزاد ہو جائے گا —— آزاد۔

"کشور چھ بجنے میں صرف پانچ منٹ"۔ قریب کے کمرہ سے ایک بھاری سی مردانہ آواز آئی۔ اور کشور سر سے پیر تک لرز گئی۔ وہ جھپٹ کر سنگھار میز کے قریب گئی۔ میں سمجھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دراز کھولے اور سم قاتل اس کے ہونٹوں سے گزرے میں پہنچ گئی اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی ساری کا پلو گر گیا اور وہ بے طرح گھبرا گئی۔

"کشور..... اتنی بزدلی..... جانتی ہو خودکشی....."

"ارنہہ۔ میں تو بٹوہ نکال رہی ہوں۔ بٹھو ریحانہ میں تمھیں ایک بات بتانا چاہتی.....". وہ کچھ چھپا رہی تھی مجھ سے بہت کچھ۔

"کشور تیار ہو چکو"۔ وہ کریہہ اور بھرائی ہوئی آواز پھر گونجی اور کشور اور بھی پریشان ہو گئی میں جانتی تھی اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی۔ جس طرح سولی پر چڑھنے سے پہلے خوفناک گھڑیال بھیانک آواز میں گھنگھناتا ہے، اسی طرح یہ آواز..... بھرائی۔

"اور لیلارام سے یہاں بھی تو جانا ہے"۔ اور پھر ایک سیٹی شروع ہو گئی۔

"ذرا ٹھہرو ریحانہ میں ابھی آئی"۔ میں نے اسے روکنا چاہا۔ لیکن راحت نے میرا ہاتھ روک دیا۔

"ریحانہ کیا ہے۔ تم بالکل ہی بچہ ہو..... سنو تمھیں نہیں معلوم کہ....."

"میں نے اب اس کی بات ایک نہیں سنی۔ پاس کے کمرے سے وہی گڑگڑاتی آواز قہقہہ لگا رہی تھی۔ دبے ہوئے گھرے قہقہے اور کشور گویا سسکیاں لے رہی تھی، باریک اور دبی ہوئی آہیں۔

"لاحول ولاقوۃ"۔ وہ موٹی آواز میں بولی۔

"سنو تو..... سنو تو"۔ کشور کی پریشان آواز آئی۔ وہ اس مردود کی التجائیں

کر رہی تھی، پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کسی کو پکڑ کر گھسیٹ رہا ہو اور وہ خوشامد کرے جان کنی میں .... پناہ مانگے۔ اور پھر اور بھی گھٹی گھٹی آواز آنے لگی گویا کوئی زبردست درندہ کشور کو بھنبوڑ رہا ہو۔ میری کنپٹیاں پھڑپھڑانے لگیں۔ نسیں کھنچ گئیں اور ہاتھ اکڑ گئے۔ وہ وقت آپہنچا تھا۔ میں ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"ہیں ہیں ریحانہ کیا کرتی ہو"۔ راحت نے مجھے روکا۔

"کشور .... میری کشور"۔ میں بے ساختہ چیخ پڑی اور دوسرے لمحے دروازہ کا پردہ الگ ہو گیا۔ اوہ تھوڑی دیر کے لئے میری ساری طاقتیں سلب ہو گئیں۔ بیچوں بیچ کمرے میں ایک الماری سے ذرا ہٹ کر شوکت کے بھیانک اور ظالم بازوؤں میں ایک مردہ چڑیا کی طرح کشور نڈھال ہو رہی تھی اور وہ .... یہ سمجھ لیجئے کہ کبوتر کو آپ نے کبھی بچے کو دانہ بھراتے دیکھا ہے۔ بس بالکل ویسے ہی۔ بالکل اسی طرح۔ دوسرے لمحے شوکت تو سر کھجا کھجا کر پاس ٹنگی ہوئی تصویر میں رنگوں کی آمیزش دیکھ رہے تھے اور کشور جلدی جلدی اپنا منہ کھول اور بند کر رہی تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ لال تھا۔

"یہ .... یہ شوکت ہے ریحانہ .... شوکت"۔ کشور کہہ رہی تھی۔

○

جب میں برآمدے میں سر لٹکائے لڑکھڑاتے قدموں سے واپس ہو رہی تھی تو میں نے ضمیر کو ایک لمبا سا پارسل لئے دیکھا۔ وہ اس میں سے اس کے لئے نیا ریکٹ نکال رہا تھا۔ وہ خود اپنی انگلی پر انگوٹھی کی چمک دیکھنے میں غرق تھی وہ ہنسے۔

مگر میرے کان میرے جسم سے دور کہیں موت کا سا نغمہ سن رہے تھے اور میری آنکھیں فضا میں ہزاروں جنازوں کے جلوس گزرتے دیکھ رہی تھیں!!!۔

لحاف

جب میں جاڑوں میں لحاف اوڑھتی ہوں تو پاس کی دیوار پر اس کی پرچھائیں
ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک دم سے میرا دماغ بیتی ہوئی دنیا
کے پردوں میں دوڑنے بھاگنے لگتا ہے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا ہے۔

معاف کیجئے گا میں آپ کو خود اپنے لحاف کا رومان انگیز ذکر بتانے نہیں جا رہی
ہوں۔ نہ لحاف سے کسی قسم کا رومان جوڑا ہی جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں کمبل کم آرام
دہ سہی مگر اس کی پرچھائیں اتنی بھیانک نہیں ہوتی جتنی ــــــ جب لحاف کی پرچھائیں
دیوار پر ڈگمگا رہی ہو۔ یہ جب کا ذکر ہے جب میں چھوٹی سی تھی اور دن بھر بھائیوں
اور ان کے دوستوں کے ساتھ مار کٹائی میں گزار دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ
میں کمبخت اتنی لڑاکا کیوں تھی۔ اس عمر میں جبکہ میری اور بہنیں عاشق جمع کر رہی تھیں۔
میں اپنے پرائے ہر لڑکے اور لڑکی سے جوتم پیزار میں مشغول تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اماں جب آگرہ جانے لگیں تو ہفتہ بھر کے لئے مجھے اپنی ایک منہ
بولی بہن کے پاس چھوڑ گئیں۔ ان کے یہاں، اماں خوب جانتی تھیں کہ چوہے کا بچہ بھی نہیں
اور میں کسی سے بھی لڑ بھڑ نہ سکوں گی۔ سزا تو خوب تھی میری! ہاں تو اماں مجھے بیگم جان

کے پاس چھوڑ گئیں۔ وہی بیگم جان جن کا لحاف اب تک میرے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہے۔ یہ وہ بیگم جان تھیں جن کے غریب ماں باپ نے نواب صاحب کو اس لئے داماد بنا لیا کہ گو وہ "پکی" عمر کے تھے مگر تھے نہایت نیک۔ کبھی کوئی رنڈی یا بازاری عورت ان کے یہاں نظر نہ آئی۔ خود حاجی تھے اور بہتوں کو حج کرا چکے تھے۔

مگر انھیں ایک نہایت عجیب و غریب شوق تھا۔ لوگوں کو کبوتر پالنے کا جنون ہوتا ہے، بٹیریں لڑاتے ہیں، مرغ بازی کرتے ہیں۔ اس قسم کے واہیات کھیلوں سے نواب صاحب کو نفرت تھی۔ ان کے یہاں تو بس طالب علم رہتے تھے۔ نوجوان گورے گورے پتلی کمروں کے لڑکے۔ جن کا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔

مگر بیگم جان سے شادی کر کے تو وہ انھیں کل ساز و سامان کے ساتھ ہی گھر میں رکھ کر بھول گئے۔ اور وہ بچاری دبلی پتلی نازک سی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگیں۔

نہ جانے ان کی زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے جب وہ پیدا ہونے کی غلطی کر چکی تھیں۔ یا وہاں سے جب وہ ایک نواب کی بیگم بن کر آئیں اور چھپر کھٹ پر زندگی گزارنے لگیں۔ یا جب سے نواب صاحب کے یہاں لڑکوں کا زور بندھا۔ ان کے لئے مرغن حلوے اور لذیذ کھانے جانے لگے۔ اور بیگم جان دیوان خانے کی درازوں میں سے ان کی لچکتی کمروں والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک شبنم کے کرتے دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگیں۔

یا جب سے، جب وہ منتوں مرادوں سے ہار گئیں، چلّے بندھے اور ٹوٹکے اور راتوں کی وظیفہ خوانی بھی چت ہو گئی۔ کہیں پتھر میں جونک لگتی ہے! نواب صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر بیگم جان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ علم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ لیکن یہاں بھی انھیں کچھ نہ ملا۔ عشقیہ ناول اور جذباتی اشعار پڑھ کر اور بھی پستی چھا گئی۔ رات کی نیند بھی ہاتھ سے گئی اور بیگم جان جی جان چھوڑ کر بالکل ہی یاس و حسرت کی

پوٹ بن گئیں۔

چولے میں ڈالا تھا ایسا کپڑا لتا۔ کپڑا پہنا جاتا ہے کسی پر رعب گانٹھنے کے لیے۔ اب نہ تو نواب صاحب کو فرصت کہ شبنمی کرتوں کو چھوڑ کر ذرا ادھر توجہ کریں اور نہ وہ انھیں کہیں آنے جانے دیتے۔ جب سے بیگم جان بیاہ کر آئی تھیں رشتہ دار آکر مہینوں رہتے اور چلے جاتے۔ مگر وہ بچاری قید کی قید رہتیں۔

ان رشتہ داروں کو دیکھ کر اور بھی ان کا خون جلتا تھا کہ سب کے سب مزے سے مال اڑانے، عمدہ گھی نگلنے، جاڑے کا ساز و سامان بنوانے آن مرتے اور وہ باوجود نئی ردئی کے لحاف کے پڑی سردی میں اکڑا کرتیں۔ ہر کروٹ پر لحاف نئی نئی صورتیں بنا کر دیوار پر سایہ ڈالتا۔ مگر کوئی بھی سایہ ایسا نہ تھا جو انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہو۔ مگر کیوں جئے پھر کوئی؟ ــــــ زندگی! بیگم جان کی زندگی جو تھی۔ جینا بدا تھا نصیبوں میں، وہ پھر جینے لگیں اور خوب جئیں!۔

ربّو نے انھیں نیچے گرتے گرتے سنبھال لیا۔ چٹ پٹ دیکھتے دیکھتے ان کا سوکھا جسم بھرنا شروع ہوا۔ گال چمک اٹھے اور حسن پھوٹ نکلا۔ ایک عجیب و غریب تیل کی مالش سے بیگم جان میں زندگی کی جھلک آئی۔ معاف کیجئے گا اس تیل کا نسخہ آپ کو بہترین سے بہترین رسالہ میں بھی نہ ملے گا۔

○

جب میں نے بیگم جان کو دیکھا تو وہ چالیس بیالیس کی ہوں گی۔ افوہ کس شان سے وہ مسند پر نیم دراز تھیں اور ربّو ان کی پیٹھ سے لگی بیٹھی کمر دبا رہی تھی۔ ایک اودے رنگ کا دوشالہ ان کے پیروں پر پڑا تھا اور وہ مہارانی کی طرح شان دار معلوم ہو رہی تھیں، مجھے ان کی شکل بے انتہا پسند تھی۔ میرا جی چاہتا تھا گھنٹوں بالکل پاس سے ان کی صورت دیکھا کروں۔ ان کی رنگت بالکل سفید تھی۔ نام کو سرخی کا ذکر نہیں۔ اور بال

سیاہ اور تیل میں ڈوبے رہتے تھے۔ میں نے آج تک ان کی مانگ ہی بگڑی نہ دیکھی۔ کیا مجال جو ایک بال ادھر ادھر ہو جائے۔ ان کی آنکھیں کالی تھیں اور ابرو پر کے زائد بال علیحدہ کر دینے سے کمانیں سی کھچی ہوتی تھیں۔ آنکھیں ذرا تنی ہوئی رہتی تھیں۔ بھاری بھاری پھولے ہوئے پپوٹے، موٹی موٹی پلکیں، سب سے زیادہ جو ان کے چہرے پر حیرت انگیز، جاذب نظر چیز تھی وہ ان کے ہونٹ تھے۔ عموماً وہ سرخی سے رنگے رہتے تھے۔ اوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں سی تھیں اور کنپٹیوں پر لمبے لمبے بال۔ کبھی کبھی ان کا چہرہ دیکھتے دیکھتے عجیب سا لگنے لگتا تھا۔ کم عمر لڑکوں جیسا!۔

ان کے جسم کی جلد بھی سفید اور چکنی تھی، معلوم ہوتا تھا کسی نے کس کر ٹانکے لگا دیئے ہوں۔ عموماً وہ اپنی پنڈلیاں کھجانے کے لئے کھولتیں تو میں چپکے چپکے ان کی چمک دیکھا کرتی۔ ان کا قد بہت لمبا تھا اور پھر گوشت ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی لمبی چوڑی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن بہت متناسب اور ڈھلا ہوا جسم تھا۔ بڑے بڑے چکنے اور سفید ہاتھ اور سڈول کمر، تو ربّو ان کی پیٹھ کھجایا کرتی تھی۔ یعنی گھنٹوں ان کی پیٹھ کھجاتی، پیٹھ کھجانا بھی زندگی کی ضروریات میں سے تھا۔ بلکہ شاید ضروریاتِ زندگی سے بھی زیادہ۔

ربّو کو گھر کا اور کوئی کام نہ تھا۔ بس وہ سارے وقت ان کے چھپر کھٹ پر چڑھی کبھی پیر، کبھی سر اور کبھی جسم کے اور دوسرے حصہ کو دبایا کرتی تھی۔ کبھی تو میرا دل بول اٹھتا تھا جب دیکھو ربّو کچھ نہ کچھ دبا رہی ہیں یا مالش کر رہی ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں اپنا کہتی ہوں کوئی اتنا بھی تو میرا جسم تو سڑ گل کے ختم ہو جائے۔

اور پھر یہ زور زور کی مالش کافی نہیں تھی۔ جس روز بیگم جان نہاتیں۔ یا اللہ بس دو گھنٹے پہلے سے تیل اور خوشبودار ابٹنوں کی مالش شروع ہو جاتی۔ اور اتنی ہوتی کہ میرا تو تخیل سے ہی دل لوٹ جاتا۔ کمرہ کے دروازے بند کر کے انگیٹھیاں سلگتیں اور چلتا مالش کا دور۔ عموماً صرف ربّو ہی رہتیں۔ باقی کی نوکرانیاں بڑبڑاتی دروازہ پر سے ہی ضروریات

کی چیزیں دیتی جاتیں۔

بات یہ تھی کہ بیگم جان کو کھجلی کا مرض تھا۔ بچاری کو ایسی کھجلی ہوتی تھی کہ ہزاروں تیل اور ابٹنے ملے جاتے تھے۔ مگر کھجلی تھی کہ قایم۔ ڈاکٹر حکیم کہتے "کچھ بھی نہیں۔ جسم صاف چٹ پڑا ہے۔ ہاں کوئی جلد کے اندر بیماری ہو تو خیر۔" نہیں بھئی یہ ڈاکٹر تو موئے ہیں پاگل کوئی آپ کے دشمنوں کو مرض ہے؟ اللہ رکھے خون میں گرمی ہے۔" ربو مسکرا کر کہتی مہین مہین نظروں سے بیگم جان کو گھورتی۔ اوہ یہ ربو ـــــ جتنی یہ بیگم جان گوری تھیں اتنی ہی یہ کالی۔ جتنی بیگم جان سفید تھیں اتنی ہی یہ سرخ۔ بس جیسے تپایا ہوا لوہا۔ ہلکے ہلکے چیچک کے داغ۔ گٹھا ہوا ٹھوس جسم۔ پھرتیلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ کسی ہوئی چھوٹی سی توند، بڑے بڑے پھولے ہوئے ہونٹ جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے اور جسم میں سے عجیب گھبرانے والی بو کے شرارے نکلتے رہتے تھے۔ اور یہ ننھے ننھے پھولے ہوئے ہاتھ کس قدر پھرتیلے تھے ابھی کمر پر، تو وہ لیجئے پھسل کر گئے کولھوں پر وہاں سے ریٹے رانوں پر اور پھر دوڑ ٹخنوں کی طرف۔ میں تو جب کبھی بیگم جان کے پاس بیٹھتی یہی دیکھتی کہ اب اس کے ہاتھ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

گرمی جاڑے بیگم جان حیدرآبادی جالی کارگے کے کرتے پہنتیں۔ گہرے رنگ کے پاجامے اور سفید جھاگ سے کرتے اور پنکھا بھی چلتا ہو۔ پھر بھی وہ ہلکی دلائی ضرور جسم پر ڈھکے رہتی تھیں۔ انھیں جاڑا بہت پسند تھا۔ جاڑے میں مجھے ان کے یہاں اچھا معلوم ہوتا۔ وہ ہلتی جلتی بہت کم تھیں۔ قالین پر لیٹی ہیں۔ پیٹھ کھج رہی ہے۔ خشک میوے چبا رہی ہیں اور بس۔ ربو سے دوسری ساری نوکرانیاں خار رکھتی تھیں۔ چڑیل بیگم جان کے ساتھ کھاتی، ساتھ اٹھتی بیٹھتی، اور ماشاء اللہ ساتھ ہی سوتی تھی۔ ربو اور بیگم جان عام جلسوں اور مجموعوں کی دلچسپ گفتگو کا موضوع تھیں۔ جہاں ان دونوں کا ذکر آیا اور قہقہے اٹھے۔ لوگ نہ جانے کیا کیا چٹکلے غریب پر اڑاتے۔ مگر وہ دنیا میں کسی سے ملتی ہی نہ تھیں۔ وہاں تو بس وہ تھیں اور

ان کی کھجلی۔

میں نے کہا "کر اس وقت میں کافی چھوٹی تھی اور بیگم جان پر فدا۔ وہ بھی مجھے بہت ہی پیار کرتی تھیں۔ اتفاق سے اماں آگرے گئیں۔ انھیں معلوم تھا کہ اکیلے گھر میں بھائیوں سے مار کٹائی ہوگی۔ ماری ماری پھروں گی۔ اس لئے وہ ہفتہ بھر کے لئے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ میں بھی خوش اور بیگم جان بھی خوش۔ آخر کو اماں کی بھابی بنی ہوئی تھیں۔

سوال یہ اٹھا کہ میں سوؤں کہاں؟ قدرتی طور پر بیگم جان کے کمرے میں، لہذا میرے لئے بھی ان کے چھپر کھٹ سے لگا کر چھوٹی سی پلنگڑی ڈال دی گئی۔ دس گیارہ بجے تک تو باتیں کرتے رہے۔ میں اور بیگم جان چانس کھیلتے رہے اور پھر میں سونے کے لئے اپنے پلنگ پر چلی گئی۔ اور جب میں سوئی تو ربو ویسی ہی بیٹھی ان کی پیٹھ کھجا رہی تھی۔ "بھنگن کہیں کی"—— میں نے سوچا۔ رات کو میری ایکدم سے آنکھ کھلی تو مجھے عجیب طرح کا ڈر لگنے لگا۔ کمرہ میں گھپ اندھیر۔ اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا لحاف ایسے ہل رہا تھا جیسے اس میں ہاتھی بند ہو۔ "بیگم جان ——" میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی، ہاتھی ہلنا بند ہوگیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔

"کیا ہے —— سو رہو ——" بیگم جان نے کہیں سے آواز دی۔

"ڈر لگ رہا ہے ——" میں نے چوہے کی سی آواز سے کہا۔

"سو جاؤ —— ڈر کی کیا بات ہے —— آیۃ الکرسی پڑھ لو۔"

"اچھا ——" میں نے جلدی جلدی آیۃ الکرسی پڑھی۔ مگر یَعْلَمُ مَا بَیْنَ پر ہر دفعہ آکر اٹک گئی۔ حالانکہ مجھے اس وقت پوری آیۃ یاد ہے۔

"تمھارے پاس آجاؤں۔ بیگم جان ——"

"نہیں —— بیٹی —— سو رہو ——" ذرا سختی سے کہا۔

اور پھر دو آدمیوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنائی دینے لگی —— ہائے رے

یہ دوسرا کون ؟ میں اور بھی ڈری۔

"بیگم جان ـــــ چور دور تو نہیں ـــــ"

"سو جاؤ بٹیا ـــــ کیسا چور ـــــ ربّو کی آواز آئی۔ میں جلدی سے لحاف میں منہ ڈال کر سو گئی۔

صبح میرے ذہن میں رات کے خوفناک نظارے کا خیال بھی نہ رہا۔ میں ہمیشہ کی وہمی ہوں۔ رات کو ڈرنا، اٹھ اٹھ کر بھاگنا اور بڑبڑانا تو بچپن میں روز ہی ہوتا تھا سب تو کہتے تھے مجھ پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا مجھے خیال بھی نہ رہا۔ صبح کو لحاف بالکل معصوم نظر آ رہا تھا۔ مگر دوسری رات میری آنکھ کھلی تو ربو اور بیگم جان میں کچھ جھگڑا بڑی خاموشی سے چھپر کھٹ پر ہی طے ہو رہا تھا اور میری خاک سمجھ میں نہ آیا تھا اور کیا فیصلہ ہوا۔ ربو ہچکیاں لے کر روئی۔ پھر بلی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں ـــــ اونہہ میں تو گھبرا کر سو گئی۔

آج ربو اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ بڑا جھگڑالو تھا۔ بہت کچھ بیگم جان نے کیا۔ اسے دوکان کرائی ـــــ گاؤں میں لگایا۔ مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں تھا۔ نواب صاحب کے یہاں کچھ دن رہا۔ خوب جوڑے باگے بھی بنے پر نہ جانے کیوں ایسا بھاگا کہ ربو سے ملنے بھی نہ آتا ـــــ لہٰذا ربو ہی اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں اس سے ملنے گئی تھی۔ بیگم جان نہ جانے دیتی۔ مگر ربو بھی مجبور ہو گئی۔

سارا دن بیگم جان پریشان رہیں۔ ان کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا رہا۔ کسی کا چھونا بھی انھیں نہ بھاتا تھا۔ انھوں نے کھانا بھی نہ کھایا اور سارا دن اداس پڑی رہیں۔

"میں کھجا دوں بیگم جان ـــــ" میں نے بڑے شوق سے تاش کے پتے بانٹتے ہوئے کہا۔ بیگم جان مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔

"میں کھجا دوں ـــــ سچ کہتی ہوں ـــــ" میں نے تاش رکھ دیئے۔

میں تھوڑی دیر تک کھجاتی رہی اور بیگم جان چپکی لیٹی رہیں۔ دوسرے دن ربو کو آنا تھا ــــ مگر وہ آج بھی غائب تھی۔ بیگم جان کا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا ــــ چائے پی پی کر انھوں نے سر میں درد کر لیا۔

میں پھر کھجانے لگی ان کی پیٹھ ــــ چکنی میز کی تختی جیسی پیٹھ ــــ میں ہولے ہولے کھجاتی رہی۔ ان کا کام کر کے کیسی خوشی ہوئی تھی!

"ذرا زور سے کھجاؤ ــــ بند کھول دو ــــ" بیگم جان بولیں۔ "ادھر ــــ اے ہے ذرا شانے سے نیچے ــــ ہاں ــــ واہ بھئی واہ ــــ ہا ــــ ہا ــــ" وہ سرور میں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے کر اطمینان ظاہر کرنے لگیں۔

"اور ادھر ــــ" حالانکہ بیگم جان کا ہاتھ خوب جا سکتا تھا۔ مگر وہ مجھ سے ہی کھجوا رہی تھیں اور مجھے الٹا فخر ہو رہا تھا۔ "یہاں ــــ اوئی ــــ تم تو گدگدی کرتی ہو ــــ واہ ــــ" وہ ہنسیں۔ میں باتیں بھی کر رہی تھی اور کھجا بھی رہی تھی۔

"تمھیں کل بازار بھیجوں گی ــــ کیا لوگی ــــ وہی سوتی جاگتی گڑیا؟"

"نہیں بیگم جان ــــ میں تو گڑیا نہیں لیتی ــــ کیا بچہ ہوں اب میں ــــ"

"بچہ نہیں تو کیا بوڑھی ہو گئی ــــ" وہ ہنسیں ــــ "گڑیا نہیں تو بنوا لینا ــــ کپڑے پہنانا خود۔ میں دوں گی تمھیں بہت سے کپڑے۔ سنا ــــ" انھوں نے کروٹ لی۔

"اچھا" میں نے جواب دیا۔

"ادھر ــــ" انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں کھجلی ہو رہی تھی رکھ دیا۔ جہاں انھیں کھجلی معلوم ہوتی وہاں میرا ہاتھ رکھ دیتیں اور میں بے خیالی میں ببوئے کے دھیان میں ڈوبی مشین کی طرح کھجاتی رہی اور وہ متواتر باتیں کرتی رہیں۔

"سنو تو ــــ تمھاری فراکیں کم ہو گئی ہیں۔ کل درزی کو دے دوں گی۔ کہ نئی سی لائے۔ تمھاری اماں کپڑا دے گئی ہیں۔"

"وہ لال کپڑے کی نہیں بنواؤں گی ـــــ چمارون جیسا ہے ـــــ" میں بکواس کر رہی تھی اور ہاتھ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم بھی نہ ہوا بیگم جان تو چت لیٹی تھیں ـــــ ارے ـــــ میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اوئی لڑکی ـــــ دیکھ کر نہیں کھجاتی ـــــ میری پسلیاں نوچے ڈالتی ہے ـــــ" بیگم جان شرارت سے مسکرائیں اور میں جھینپ گئی۔

"ادھر آ کر میرے پاس لیٹ جا ـــــ" انھوں نے مجھے بازو پر سر رکھ کر لٹا لیا۔

"اے ہے کتنی سوکھ رہی ہے ـــــ پسلیاں نکل رہی ہیں۔" انھوں نے میری پسلیاں گننا شروع کیں۔

"اوں ـــــ" میں منمنائی۔

"اوئی ـــــ تو کیا میں کھا جاؤں گی ـــــ کیسا تنگ سوئٹر بنا ہے!"

"گرم بنیان بھی نہیں پہنا تم نے ـــــ" میں کلبلانے لگی۔

"کتنی پسلیاں ہوتی ہیں ـــــ" انھوں نے بات بدلی۔

"ایک طرف نو اور دوسری طرف دس۔" میں نے اسکول میں یاد کی ہوئی ہائی جین کی مدد لی۔ وہ بھی اوٹ پٹانگ۔

"ہٹاؤ تو ہاتھ ـــــ ہاں، ایک ـــــ دو ـــــ تین ـــــ"

"میرا دل چاہا کسی طرح بھاگوں ـــــ اور انھوں نے زور سے بھینچا۔

"اوں ـــــ" میں مچل گئی ـــــ بیگم جان زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اب بھی جب کبھی میں ان کا اس وقت کا چہرہ یاد کرتی ہوں تو دل گھبرانے لگتا ہے ـــــ ان کی آنکھوں کے پپوٹے اور وزنی ہو گئے۔ اوپر کے ہونٹ پر سیاہی گھری ہوئی تھی۔ باوجود سردی کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ہونٹوں اور ناک پر چمک رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ ٹھنڈے یخ تھے۔ مگر نرم نرم جیسے ان پر کی کھال اتر گئی ہو۔ انھوں نے شال اتار دی تھی اور کارگے کے

مہین کرتے میں ان کا جسم آٹے کی لوئی کی طرح چمک رہا تھا۔ بھاری جڑاؤ سونے کے بٹن گریبان کے ایک طرف جھول رہے تھے۔ شام ہو گئی تھی۔ اور کمرہ میں اندھیرا گھپ ہو رہا تھا۔ مجھے ایک نامعلوم ڈر سے دحشت سی ہونے لگی۔ بیگم جان کی گہری گہری آنکھیں۔ میں رونے لگی دل میں۔ وہ مجھے ایک مٹی کے کھلونے کی طرح بھینچ رہی تھیں۔ ان کے گرم گرم جسم سے میرا دل ہولانے لگا۔ مگر ان پر تو جیسے کوئی بھتنا سوار تھا اور میرے دماغ کا یہ حال کہ نہ چیخا جائے اور نہ رو سکوں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پست ہو کر نڈھال لیٹ گئیں۔ ان کا چہرہ پھیکا اور بدرونق ہو گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ میں سمجھی کہ اب مریں یہ، اور وہاں سے اٹھ کر سرپٹ بھاگی باہر —— !

شکر ہے کہ ربو رات کو آ گئی اور میں ڈری ہوئی جلدی سے لحاف اوڑھ سو گئی۔ مگر نیند کہاں۔ چپ گھنٹوں پڑی رہی۔

اماں کسی طرح آ ہی نہیں چکی تھیں۔ بیگم جان سے مجھے ایسا ڈر لگتا تھا کہ میں سارا دن ماماؤں کے پاس بیٹھی رہی۔ مگر ان کے کمرے میں قدم رکھتے دم نکلتا تھا۔ اور کہتی کس سے اور کہتی ہی کیا کہ بیگم جان سے ڈر لگتا ہے ؟ تو یہ بیگم جان جو میرے اوپر جان چھڑکتی تھیں۔

○

آج ربو میں اور بیگم جان میں پھر ان بن ہو گئی —— میری قسمت کی خرابی کہیئے یا کچھ اور مجھے ان دونوں کی ان بن سے ڈر لگا۔ کیونکہ فوراً ہی بیگم جان کو خیال آیا کہ میں باہر سردی میں گھوم رہی ہوں اور مروں گی نمونیہ میں۔

"لڑکی کیا میرا سر منڈوائے گی۔ جو کچھ ہو ہوا گیا تو اور آفت آئے گی۔" انھوں نے مجھے پاس بٹھا لیا۔ وہ خود منہ ہاتھ سلفچی میں دھو رہی تھیں۔ چائے تپائی پر رکھی تھی۔

"چائے تو بناؤ —— ایک پیالی مجھے بھی دینا ——" وہ تولیہ سے منہ خشک

کر کے بولیں ــــ "میں ذرا کپڑے بدل لوں"۔

وہ کپڑے بدلتی رہیں اور میں چائے پیتی رہی۔ بیگم جان نائن سے پیٹھ ملواتے وقت اگر مجھے کسی کام سے بلاتیں تو میں گردن موڑے موڑے جاتی۔ اور واپس بھاگ آتی۔ اب جو انھوں نے کپڑے بدلے تو میرا دل الٹنے لگا۔ منہ موڑے میں چائے پیتی رہی۔

"ہائے اماں ــــ" میرے دل نے بے کسی سے پکارا ــــ "آخر ایسا میں بھائیوں سے کیا لڑتی ہوں جو تم میری مصیبت ــــ" اماں کو ہمیشہ سے میرا لڑکوں کے ساتھ کھیلنا ناپسند ہے، کہو بھلا لڑکے کیا شیر چیتے ہیں جو نگل جائیں گے ان کی لاڈلی کو۔ اور لڑکے بھی کون؟ خود بھائی اور دو چار سڑے سڑائے ذرا ذرا سے ان کے دوست۔ مگر نہیں وہ تو عورت ذات کو سات تالوں میں رکھنے کی قائل اور یہاں بیگم جان کی وہ دہشت کہ دنیا بھر کے غنڈوں سے نہیں۔ بس چلتا تو اس وقت سڑک پر بھاگ جاتی پر وہاں نہ ٹکتی۔ مگر لاچار تھی۔ مجبوراً کلیجہ پر پتھر رکھے بیٹھی رہی۔

کپڑے بدل سولہ سنگھار ہوئے۔ اور گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انھیں انگارہ بنادیا اور وہ چلیں مجھ پر لاڈ اتارنے:۔

"گھر جاؤں گی ــــ" میں نے ان کی ہر رائے کے جواب میں کہا اور رونے لگی۔

"میرے پاس تو آؤ میں ــــ تمھیں بازار لے چلوں گی ــــ سنو تو ــــ"

مگر میں کھلی کی طرح پھیل گئی ــــ سارے کھلونے، مٹھائیاں ایک طرف اور گھر جانے کی رٹ ایک طرف۔

"وہاں بھیا ماریں گے ــــ چڑیل ــــ" انھوں نے پیار سے مجھے تھپڑ لگایا۔

"پڑے ماریں بھیا ــــ" میں نے دل میں سوچا۔ اور روٹھی اکڑی بیٹھی رہی۔

"کچی امیاں کھٹی ہوتی ہیں بیگم جان ــــ" جلی کٹی ربو نے رائے دی۔ اور پھر اس کے بعد بیگم جان کو دورہ پڑ گیا۔ سونے کا ہار جو وہ تھوڑی دیر پہلے مجھے پہنا رہی تھیں

ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مہین جالی کا دوپٹہ تار تار۔ اور وہ مانگ جو میں نے کبھی بگڑی نہ دیکھی تھی جھاڑ جھنکاڑ ہو گئی۔

"اوہ ـــــ اوہ اوہ اوہ ـــــ" وہ جھٹکے لے لے کر چلانے لگیں۔ میں رینگی باہر آئی۔ بڑے جتنوں سے بیگم جان کو ہوش آیا۔ جب میں سونے کے لئے کمرے میں دبے پیر جا کر جھانکی تو ربو ان کی کمر سے لگی جسم دبا رہی تھی۔

"جوتی اتار دو ـــــ" اس نے ان کی پسلیاں کھجاتے ہوئے کہا۔ اور میں چوہیا کی طرح لحاف میں دبک گئی۔

سر سر پھٹ پچ ـــــ بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔ "اللہ! آں ـــــ" میں نے مری ہوئی آواز نکالی۔ لحاف میں ہاتھی پھدکا اور بیٹھ گیا۔ میں بھی چپ ہو گئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ مچائی۔ میرا رواں رواں کانپا۔ آج میں نے دل میں ٹھان لیا کہ ضرور ہمت کر کے سرہانے کا لگا ہوا بلب جلا دوں۔ ہاتھی پھر پھڑپھڑا رہا تھا اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چپڑ چپڑ کچھ کھانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی مزے دار چٹنی چکھ رہا ہو۔ اب میں سمجھی! یہ بیگم جان نے آج کچھ نہیں کھایا۔ اور ربو مردی تو ہے سدا کی چٹو۔ ضرور یہ تر مال اڑا رہی ہے۔ میں نے نتھنے پھلا کر "سوں سوں" ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ نہ محسوس ہوا۔

لحاف پھر امنڈنا شروع ہوا۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ چپکی پڑی رہوں۔ مگر اس لحاف نے تو ایسی عجیب عجیب شکلیں بنانی شروع کیں کہ میں لرز گئی۔ معلوم ہوتا تھا غوں غوں کر کے کوئی بڑا سا مینڈک پھول رہا ہے اور اب اچھل کر میرے اوپر آیا۔

"آ ـــــ ن ـــــ اماں" ـــــ میں ہمت کر کے گنگنائی۔ مگر وہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی اور لحاف میرے دماغ میں گھس کر پھولنا شروع ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے

پلنگ کے دوسری طرف پیر اتارے اور ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا۔ ہاتھی نے لحاف کے نیچے ایک قلابازی لگائی اور پچک گیا۔ قلابازی لگانے میں لحاف کا کونا فٹ بھر اٹھا ـــــ اللہ! میں غڑاپ سے اپنے بچھونے میں!!!۔

بیمار

اور پھر دندناکر بخار چڑھتا اور گھگھی بندھ جاتی۔ معلوم ہوتا ہڈیاں چٹ چٹا رہی ہیں۔ اور کھال جھلسنے لگتی۔ گلے میں رہٹ چلنے لگتا۔ چوں، چر ــــ شرڑ و کھڑا اور پھر کھانسی کے پھندے پڑنے لگتے۔

زبان تو جوتے کا تلا ہو گئی تھی۔ پھیکی، کھٹی سڑاندی دوائیں کھاتے کھاتے اس میں جو کلیاں ہوتی ہیں وہ بھی مردہ ہو گئی تھیں۔ اسے یاد آتا تھا، جبکہ وہ چھوٹا سا تھا تو کونین کتنی کڑوی، املیاں کتنی کھٹی اور شکر کی گولیاں کتنی میٹھی ہوتی تھیں! اس کی زبان کیسی جاندار اور حساس تھی! اور اب وہی زبان کس قدر ڈھیٹ ہو گئی تھی کہ کسی چیز کا اثر بھی نہ ہوتا تھا۔

بچے آنگن میں کلکاریاں مارتے اور ایسا معلوم ہوتا اس کے کلیجے پر گھن برس رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے دروازے دھڑ دھڑاتے ہوئے نکل جاتے اور اس کی زندہ لاش سر سے پیر تک لرز جاتی۔ پھر دوسری آوازیں، بھونپو والی لاریاں، کوکتی ہوئی موٹریں، کھڑ کھڑاتے تانگے اور منمناتی ہوئی سائیکلیں، سب گویا اس کے سینہ پر سے دندناتی گذرتیں۔

"رام رام ست ہے"۔ اس کا کلیجہ مسل جاتا۔

"لینا دوڑنا ــــ چلیو!"۔ وہ اپنا منہ معجونوں میں بسے ہوئے لحاف میں دبا لیتا۔ گویا لوگ اسے ہی مارنے دوڑ رہے ہیں۔

اور کتّے؟ کتّے تو شیر تھے، ان کا بس نہ تھا جو اس کی گود میں لیٹ لیٹ کر بھونکتے اور بلیوں کو رات کے وقت کورٹ شپ کے لیے اسی کے کمرے میں آنا فرض تھا۔ اس کی "شی شی" اور "ہش ہش" پر بلیاں مسکرا مسکرا کر اپنے عاشق بلّوں کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھتیں اور اٹھلاتی ہوئی "میاؤں" کر کے وہیں پڑ جاتیں، دو ایک دفعہ ڈرنے کے بعد اب وہ بچاگنا بیوقوفی سمجھتی تھیں۔

اور پھر ہوا خاک پڑی ہر روز اور چھید سے جھنکارتی ہوئی سیدھی اسی کی طرف لپکتی اور اس کے جسم کے ٹھنڈک کا انجکشن دینا شروع کر دیتی۔ سرسر کرتی، دریا کی طرح اس کے کانوں میں گرتی اور گردن میں سے پھسلتی ہوئی ٹھیک سینے پر جم جاتی۔ گرمیوں میں یہی ہواریت کے گرم گرم ذرے لا کر اس کے جسم پر چنگاریوں کی طرح چپکاتی اور اسے بھٹی میں سونے کا مزہ آجاتا۔ وائے موسم!

پر سب سے زیادہ دکھ دینے والی جو بات تھی وہ اس کا موٹا پڑوسی تھا۔ سرخ چقندر بڑی گھنداز مونچھوں والا۔ وہ آ کر دھوپ میں بیٹھ جاتا ــــ اور موٹا لبالب اس کے جسم سے بھر جاتا۔

"کیسے ہو بھئی؟" وہ بغیر بھولے ہوئے ہمیشہ ایک ہی لہجہ میں کہتا۔

اور پھر "بھابی ذرا پان تو دیجو ایک" وہ اس کی بیوی سے فرمائش کرتا۔ مرجھائی ہوئی آدھے درجن بچوں کی ماں لکیروں والا گتھئی رنگ کا چہرہ ذرا دیر کو مسکرا اٹھتا۔

"کبھی دہی بڑے کھلا دو نا"۔ یا "بھابی آج تو مٹر پلاؤ کھا کر ہی جاؤں گا"۔ وہ دھنسی ہوئی تیمارداری کی عادی آنکھیں تھرکنے لگتیں۔ پپوٹے جھک جاتے اور پھر وہ اسے کچھ نہ کچھ

پھینکے پرے دیتے یا کوئی اچار یا چٹنی چکھانے دوسرے برآمدے میں لے جاتی۔ وہاں سے اس کی چیٹر چیٹر کھانے اور بیوی کے کھلکھلانے کی آواز آنے لگتی۔

اس وقت فوراً اسے یا تو رفع حاجت کی اشد ضرورت لاحق ہوجاتی۔ یا پیاس اٹھ کھڑی ہوتی۔ یا اس کے کسی نہ کسی حصہ جسم کو دابنے یا مسلے جانے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی۔

اس کے کئی بار پکارنے پر وہ جلی کٹی آتی۔ آنکھیں گھومی ہوئی اور چہرہ تنا ہوا۔ گویا وہ قہقہے جو اسے دیوانہ کئے دے رہے تھے کچھ دیر پہلے ان ہونٹوں سے نہیں گذرے تھے۔ بلکہ کہیں کسی اور ہی دنیا سے آئے تھے۔ مگر گھور گھور کر اس کے منہ کو تکتا گویا وہاں کوئی چیز چپکی ہی تو رہ گئی ہوگی۔

پانی پیتے اور ہاتھ پیر مسلواتے وہ تھک جاتا۔ مگر برآمدے میں بیٹھے ہوئے جبڑے ویسے ہی چکی کی طرح چلا کرتے گویا انھوں نے اس کی ہستی ہی کو چبا ڈالنے کا ارادہ کرلیا ہوا۔

وہ بیمار تھا تو کیا۔ دل تو مردہ نہ ہوا تھا۔

پر اس میں بیوی کا کیا قصور تھا۔ وہ نوجوان تھی اور رگوں میں خون دوڑ رہا تھا۔ مگر وہ کبھی جھوٹ موٹ کو ہی اس سے کچھ کہتا تو وہ اینٹھ جاتی۔

"اے چلو مجھے یہ چونچلے نہیں پسند! اور اس کا تنکے جیسا ہاتھ ہوا میں جھولتا رہ جاتا۔ کبھی انھیں چونچلوں کے مارے اس کا میکے میں گھڑی بھر دل نہ لگتا تھا۔ دن دن بھر وہ دولہا دولھن ہوتے تھے اور بند کمرہ۔ یہی ہاتھ کتنے شریر تھے۔ اور اس پڑوسی نے تو اس کی بدھیا ہی بٹھا دی تھی۔ وہ خود نہ آتا تو قمیص میں بٹن ہی ٹانکنے کو بھیج دیتا۔ اور بیوی جان جان کر سیتے میں اسے اپنے جسم پر ڈالتی۔ گو وہ چاہتی تو مزے سے الگ سے ہی سی سکتی تھی، وہ تو پڑوسی نہیں تو اس کا کرتا یا پاجامہ، یا موزہ ہی اس کی چھاتی پر مونگ دلنے کو آن موجود ہوتا۔ اول تو تھا ہی کتنا خون جسم میں، پھر جو بچی کبھی دو چار بوندیں تھیں وہ پڑی سن سن کھولا کرتیں۔ اوہ! اس کا جی چاہتا تھا کہ یہی سوکھی سوکھی انگلیوں سے موٹے پڑوسی کے جسم پر سے گوشت کی تہیں

کی تہیں اکھیڑ ڈالے اور اوپر سے نمک برکے، مرچیں ملا کر۔ اور اس وقت اس کی زبان کا مزہ پن جاتا رہتا!۔

خاموش لیٹ کر وہ بیوی کو کسی کام میں مشغول دیکھتا! اس کے تخیل میں اسے صاف موٹے پڑوسی کی پرچھائیں نظر آتی۔ کاش وہ کسی ترکیب سے اس بدمعاش عورت کے خیالات کو قید کر سکتا! اس کا بس چلتا تو اسے سوچنے ہی نہ دیتا، پر وہ تو گویا خاموش طعنے دیتی تھی۔

"لو پکڑ لو میرے خیالوں کی ڈور کو!" وہ بڑبڑاتا۔ بدگمانیاں بڑھتیں، اسے اپنے سب بچے پڑوسی کی شکل کے معلوم ہونے لگتے۔ ویسی ہی ناچتی ہوئی آنکھیں، موٹے موٹے بدن، ویسی گھورتے ہوئے پاؤں اور سوجے ہوئے ٹخنے، بالکل پڑوسی جیسے، اور وہ انھیں قریب بلا کر گھور گھور کر دیکھتا۔ کبھی شک مٹتا۔ کبھی اور جم جاتا اور وہ پاگل ہونے لگتا۔ اس کا دماغ تلملا بازیاں کھانے لگتا۔ یہاں تک کہ اسے بیوی کے پیٹ میں صاف صاف پڑوسی کی شکل کے بچے نظر آنے لگتے۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھتا اور اسے قریب بلا کر گھورتا۔ اور دھوبن بھی کتنی بیوقوف ہے۔ آخر ساڑھیوں میں اتنا کلف دینے کی کیا ضرورت ہے؟ انسان کا دھجا ہی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ انسان کتنا پھول جاتا ہے۔ خواہ مخواہ!

"دھوبن حرامزادی سے کہو اتنا کلف نہ دے۔" وہ جھلاتا۔

"کیوں؟ اب کلف اور ساڑھیوں میں بھی تمھارا دخل ہو گیا؟" وہ تنک کر جواب دیتی۔ ساڑھیوں میں تو اس کا دخل بے شک نہیں، پر آخر کیوں؟ اور بخار انگڑائیاں لیتا، اس کی سوکھی پنڈلیاں پھٹنے لگتیں اور پھیپھڑے زخمی کبوتروں کی طرح پھڑپھڑاتے۔ کنپٹیاں پھدکنے لگتیں۔ اس کا جی چاہتا بیوی کی گردن پکڑ کر اتنی مروڑے کہ اس کا نرخرہ پھٹ جائے اور پھر اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ ناک کاٹنا گو اب بالکل فیشن میں نہیں سمجھا جاتا۔ پر اسے تو ہر لمحہ تخیل کی دنیا میں بیوی کی ناک کاٹتے ہی گذرتا۔ وہ دیکھتا کہ اس نے ناک کاٹ ڈالی ہے اور چاقو کی نوک سے اس کے چہرہ پر باریک باریک چارخانہ کاڑھ رہا ہے۔

وہ چونک کر بیوی کے چہرے کو دیکھتا۔ بے شک اس کے سارے منہ پر باریک باریک لکیریں نظر آئیں۔ لوگ کہتے تھے کہ پریشانی کی وجہ سے پڑ گئی ہیں، پر وہ خوب جانتا تھا اور دل ہی دل میں ہنستا تھا کہ یہ ہی تو لکیریں تھیں جو وہ چاقو سے اپنے تخیل کی دنیا میں کاڑھا کرتا تھا۔

رات کو بخار نئی قلابازی لگاتا۔ کوئی ٹکڑا جسم کا یخ ہو جاتا اور کوئی انگارے کی طرح بھبکا کرتا۔ آنکھیں جلتیں تو ناک برف کی ڈلی ہو جاتی اور ہتھیلیاں سلگتیں تو پنجے گلنے لگتے۔ گلے میں جیسے کوئی دہی بلو رہا ہے۔ گدی سن ہو جاتی۔ ڈاکٹر ٹٹول ٹٹول کر اس کے جسم پر گوشت کی بوٹیوں میں سوئیاں لگاتا۔ کولھوں پر گٹھلیاں پھانسوں کی طرح چبھتیں۔

ذرا آنکھ لگی اور جیسے کسی نے ہزاروں روئی کے گٹھر کے گٹھر اس پر کھول کر بکھیر دیئے۔ اور وہ سسکیاں لے لے کر اس میں ڈبکیاں لگاتا۔ ہاتھیوں کی وضع کے جانور اس کے سینے پر کودتے اور پنڈلیوں میں جیسے کوئی درے لگا رہا ہے پلنگ کے نیچے سے سینکڑوں سوکھے بے گوشت ہاتھ اس کی طرف بڑھتے۔ اس کی کنپٹیوں پر مہین مہین غیر انسانی انگلیاں رینگتیں۔ خوابوں میں اس کے کل مردہ عزیز ہاتھ پھیلا پھیلا کر اسے بلاتے بوڑھی دادی اپنا ڈگڈگاتا ہوا سر ہلا کر اسے پھسلاتی مگر وہ بڑی خوش اسلوبی سے ان لوگوں کو ٹال کر صاف لوٹ آتا۔ کہتے ہیں کہ خواب میں اگر کوئی مردہ عزیز بلائے اور اس کے ساتھ چلے جاؤ تو فوراً مر جاتے ہیں! وہ ان روحانی چالوں کو خوب جانتا تھا اور کوئی الو نہ تھا جو چکر میں آجاتا۔ آخر کیوں مرے وہ ؟ وہ انتقاماً جی رہا تھا۔ لوگوں کو کیوں آخر اس کی موت کی امیدیں لگی ہوئی تھیں ؟ نہیں مرتا وہ! پھر ؟ کسی کو کیا ؟"

وہ لوگوں کے سامنے اور اکڑ کر لیٹتا۔ کوئی ذرا سی بھی بات ہوتی تو بہادر اور چھیلے مزاج والے جوانوں کی طرح کڑک کر بولتا۔ لوگوں کے ہمدردی سے افسردہ چہروں کو دیکھ کر وہ سلگ اٹھتا۔ جی چاہتا کہ ان کی تھوتھنیوں کو کچل دے۔ جوں جوں وہ اپنے کو تندرست

دکھاتا لوگ متفکر ہو جاتے۔

"سنبھالا لے رہا ہے!" وہ سر ہلا ہلا کر کہتے۔

لوگ اسے جانے کیا سمجھتے تھے۔ کبھی وہ دن تھے جب کنبے رشتہ کی ساری کنواریاں اس سے بچائی جاتی تھیں۔ جیسے وہ انھیں کھا ہی تو جاتا۔ اور وہ لڑکیاں بھی تو اسے دیکھتے ہی تلملا اٹھتیں۔ ان کے چہرے تمتما اٹھتے اور جو کام کرتی ہوتیں وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ پڑتا بھاگتیں تو فوراً گر پڑتیں، منہ ڈھانکنا چاہتیں تو دوپٹہ ہی اتر جاتا اور وہ بے بس اس کے رحم و کرم پر رہ جاتیں۔ اور وہ تھا بھی بڑا بے رحم دل!۔

اتنی ڈھیر سی لڑکیاں اس سے شرماتی تھیں کہ وہ کچھ فیصلہ بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ کبھی منجھو پر وہ مر جاتا" کبھی جانی اس کے دل کا ٹکڑا بن جاتی اور کبھی ان سب کو مع اس پر یوں دنیا کے وہ چھوڑ کر منی کا پجاری بن جاتا اور پھر کبھی ایک دم سے گڑبڑا کر وہ سب پر ایک دم ہی لوٹ پڑتا۔

پر اب تو عرصے سے اس سے شرمانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مہترانی کی جوان بہو، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر لیتی جیسے وہ کوئی بلی یا چوہا ہے اور منجھو جن سے قریب قریب آدھی منگنی ہو گئی تھی اور شادی سے پہلے اس کے آنے کی خبر سن کر ان پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ مزے سے بیٹھی اپنے بچے کو اس کے سامنے ہی دودھ پلایا کرتی۔ اور جانی اپنی پوشیدہ بیماریوں کا ذکر اس کے ڈاکٹر سے اسی کے سامنے کھلے بندوں کرتی۔ لوگ اسے خطرے کی حدوں سے باہر کر چکے تھے۔ اس کی زندگی کے بہترین زمانے کو ناعاقبت اندیشی کا زمانہ کہہ کر معاف کر چکے تھے۔ ایک دفعہ اس نے چاہا کہ ان لوگوں کے ذرا ہوش ٹھکانے کر دے اور وہ نوجوان ململ کو دیکھ کر کچھ بڑبڑایا۔ پھر وہ بننے لگی۔

"اے ہے بھیا کا بخار بہت ہی چڑھ رہا ہے" وہ اٹھلاتی ہوئی چل دی۔ سب اسے بھیا کہنے لگے تھے۔ جب سے وہ بیمار پڑا تھا لوگ بن بن کر اسے جلاتے تھے۔ یہاں تک کہ اس

کا بوڑھا چچا تک اسے "بھیا" کہہ کر چمکارتا تھا۔ بڈھا اینٹھتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ وہ اس کے اتنا بھی نہیں جینے کا اور بہت جلد دوسری دنیا کو کوچ کر جائے گا! ہونہہ! لوگ آس لگائے لگائے مر جائیں گے۔ مگر وہ ضد میں نہیں مرے گا۔ وہ جئے گا! خواہ کتنے ہی لڑے چڑھیں پیسے پھر جائے دکھیں پڑوسی آئیں اور بیوی مسکرا مسکرا کر ان کے سڑانڈے موزے سیئے۔ پر وہ جئے گا۔ خواہ اس کے سب بچے پڑوسی کی ہم شکل ہو جائیں سب پڑوسی سے ملنے لگیں، اس کے بھائی ماں باپ، بہن سب پڑوسی کی طرح آنکھیں مٹکائیں اور پاؤں گھمائیں ٹخنے سو جائیں پر وہ جئے گا۔ انتقاماً جئے گا!! یہ تو ہونے سے رہا کہ وہ لوگوں کے اطمینان کو مر جائے۔

وہ دیکھتے ہی انسان کو بھانپ جاتا۔ وہ اپنی عیادت کرنے والوں کے چہروں کو غور سے دیکھتا۔ اگر ان پر افسردگی چھائی ہوتی تو وہ بگڑ جاتا۔ یہ سب مفسدوں کے چہرے ہوتے اور وہ انھیں جلے کٹے جواب دیتا۔ جو لوگ مریض کا دل خوش کرنے کو ذرا مسکرا کر آتے انھیں وہ مکار سمجھتا۔ وہ الو سمجھتے ہیں کیا ہے وہ گھر سے ہی اسے "بس اب اچھے ہو جاؤ گے"۔ "اللہ نے چاہا تو جلد شفا ہوگی"۔ جیسے سنانے آتے تھے اور ایسے لوگوں کے نازک معاملات پر گفت و شنید شروع کر دیتا۔ ان کے چہروں سے مسکراہٹ اڑ جاتی۔ اور وہ بدحواس ہو جاتے اور جو اگر کسی کے چہرے سے کچھ بھی نہ ظاہر ہوتا تو وہ اسے پکا الو سمجھ لیتا۔ وہ اسے عجیب و غریب طریقوں سے نقصان اٹھانے ذلیل ہونے، لٹھ بازی کرنے اور مقدمہ چلانے کے فوائد سمجھایا کرتا۔ یہاں تک کہ عیادت کو آنے والے کے چہرے پر وحشت اور جنون کے تسلی بخش آثار نظر آنے لگتے۔ تب وہ اطمینان سے ہنستا۔ اور آؤ گے؟ خواہ مخواہ! وہ دل ہی دل میں اس سے پوچھتا۔

جتنے ڈاکٹر آتے بدمزہ سے بدمزہ دوا تجویز کرتے، اس کے سینے پر مالش کرنے یا انجکشن لگانے کے بہانہ اس کی بیوی کی فضول مدد کے خواستگار ہوتے۔ وہ بے بات بھی اس کی انگلیاں ٹٹولنے اور خون کی کمی وغیرہ کے بہانے اسے مرغن کھانے اور لذیذ دوائیں کھانے کو

بتا جاتے۔ کوئی ہی ایسا ڈاکٹر ہوگا جس نے فوراً بیوی کے لئے نسخہ پر نسخہ نہ لکھ دیا ہو! وہ انھیں موٹی موٹی گالیاں دیتا اور کل بیوی کے نسخے پھاڑ ڈالتا اس کا بس نہیں تھا کہ مٹھی بھر اپنے جراثیم پچھاڑ کر جلا دیتا۔

کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ یہی بیوی اس کے جنم مرن کی ساتھی بنی تھی اور سنگ میں جان دینے کے وعدے کر چکی تھی پر اب جراثیم کے ڈر سے فینائل سے ہاتھ دھوتی اور سوڈے سے غرارے کرتی تھی۔ کتنی گہری خلیج دونوں میں حائل ہوگئی تھی۔

اور پھر بخار چڑھتا، پھیپھڑے پھولتے، گلے میں گاڑی سی چلتی، ہڈیاں چٹختیں اور وہ جسمانی اور روحانی دکھوں میں ڈوب جاتا!

میرا بچہ

کیوں رے گتے

"اے لو سوا سات سیر کے ـــــ چھوٹے سیر سے"۔ رشید کی ماں نے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ رضائی سے نکال کر پھر واپس رکھ لیا۔ گویا اس مہنگی موٹی دنیا سے دست بردار ہو گئیں۔

"اور گھی دہی گھاسلیٹ کا! بہن، لالہ جی تو منہ پر نہیں دھرتے، بس تو دودھ منگا کر گھر میں بلو لیتی ہوں۔ اور چھاچھ بھی کام ہی آجاتی ہے"۔ سٹھانی نے کنجوسی سے متاثر ہو کر کہا۔

"ترکیب تو اچھی ہے۔ رشید بھی گھی دیکھ کر منہ بناتا ہے۔ کہتا ہے روکھی کھالوں گا پر گھاسلیٹ تو نہیں چلتا۔ بہت کچھ کرتی ہوں بہن میری بلونا اب کون کرے۔ ہاں مکھن منگا لیتی ہوں"۔

"مکھن میں کیا میل نہیں ہوتا؟ اے لو مکھن میں تو بڑے مزے سے تیل ملا دیتے ہیں۔ دودھ میں ہی ملا دیتے ہیں اور پتہ بھی نہیں چلتا ـــــ تم یہ کرو ـــــ" اور وہ نہ جانے کیا ترکیبیں بتانے لگیں۔

برجو کا دم گھٹنے لگا۔ ماسی کو پرنام کر کے وہ کونے میں بیٹھی اپنی ساری کے پلو سے کھیل رہی تھی اور اس آٹے دال کے بھاؤ سے تو اس کا دل اور بھی گھبرا رہا تھا۔ وہ کیوں آئی آخر ؟۔

"مرچیں تو مہینے کے مہینے پسوالیتی ہوں"۔ بچپن کی بچھڑی دو سہیلیاں پھر وہی غیر دلچسپ باتیں کرنے لگیں۔ اگر شاما یا اختری تو برجو کبھی بھی ان سے اس قسم کی خشک گفتگو نہ کر سکتی۔ اور پھر جو ذرا کپڑوں کے متعلق گفتگو چھڑی تو برجو نے بھی دلچسپی کا اظہار کرنے کی ہمت کی۔ مگر اس کا دل ٹوٹ گیا جب دریوں بھاڑیوں اور نواڑوں وغیرہ کا ذکر ہونے لگا۔ نیلی جارجٹ کی کنی دار ساڑھی اور شیمو کے آڑے جمپر کی کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ وہ پھر اپنے ناخن سے ساڑھی کا پلو کھرچنے لگی۔ مگر جب مٹکیوں اور صراحیوں کا ذکر آتا تو اس کے گلے میں جیسے پھندا پڑنے لگا اور وہ بولا کر کھڑی ہوگئی۔ کسی نے بھی اس کا نوٹس نہ لیا۔ چونکہ دونوں سہیلیاں بڑی سے بڑی مٹکی حیرت انگیز سستی قیمت پر خریدنے کا فخریہ قصہ سنانے پر تیار تھیں، دونوں کے میکوں میں مفت سے بھی سستی صراحیاں ملتی تھیں اور اتفاق سے دونوں کی سسرالوں میں ٹھگ بدیا کھلے بندوں ہوتی تھی۔ پلنگ کی ادوانوں اور بان کے جھینکوں کا ذکر آدھا سنا ہی چھوڑ کر وہ برآمدے میں آگئی، باہر پڑوسن کے دو بچے کھڈیوں پر بیٹھے کوئی نہایت ہی دلچسپ مسئلہ پر لڑ رہے تھے۔ دور ایک گائے کھڑی کوڑا کھا رہی تھی۔ برجو الجھ کر برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں کو دیکھنے لگی۔ دو ایک خوش رنگ پھول توڑ کر اس نے اپنی لمبی چوٹی کے بالائی سرے میں اڑس لئے اور نیچے کیاریوں میں سے دھنیے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی۔ بڑے سکھڑاپے میں آ کر اس نے منڈیر پر اگی ہوئی بیکار گھاس کو نوچ کر الگ کر دیا اور چنبیلی کی مڑی ہوئی ڈالیوں کو سیدھا کرنے لگی۔

"برجو ــــ او برجو"۔ ایک کرخت آواز اسے سنائی دی۔ اور وہ چونک پڑی۔

"ارے سنا نہیں۔ برجو ووو۔" آواز اور بھی بھاری اور کرخت ہو گئی۔ وہ دوڑ کر جلدی سے برآمدے میں آ گئی۔

"برجو برجو ——— برجو ———" کوئی مکروہ آواز پکارے گئی۔ اس کا دل چاہا جلدی سے ماں کے پاس بھاگ جائے۔ جہاں بس آٹے دال کا بھاؤ سنتی رہے مگر آواز اور بھی دھمکی آمیز اور ساتھ ساتھ امداد طلب نظر آئی۔ کیا وہ ڈرپوک تھی جو کچھ ڈر جاتی۔ نہ جانے کون جنگلی اسے کیوں پکار رہا تھا۔ آواز پھر آئی اور کوٹھے پر سے آتی معلوم ہوئی۔

نہ جانے کیوں وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی ——— یقیناً وہاں کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اماں تو نہ تھی ——— اتنی موٹی اور بھدی آواز، اور بابو جی کا تو گمان بھی ——— خیر وہ چڑھتی چلی گئی۔

"معلوم ہوتا ہے آج اس کی شامت آئی ہے۔ ارے برجو!" کسی نے سامنے سے پکارا۔ اور وہ ڈر کر روندی ہوئی دروازے تک آ ہی گئی ———!

سامنے میز کے پاس ایک کرسی پر ایک چوڑی سی برہنہ پیٹھ ایک قلم سے کھیلتی ہوئی نظر آئی۔

"کہاں مر گیا تھا کمینے۔" پیٹھ کا مالک بغیر مڑنے کی تکلیف اٹھائے ڈانٹ کر مخاطب ہوا۔ "خدا کی قسم ذرا یہ صفحہ ختم کر لوں تو ——— ہاں یہ تو بتا گیا تھا؟ ——— کیوں رے کتے؟" قلم ویسے ہی ایک لمبے صفحے پر چلتا رہا اور سر جھکا رہا۔ برجو کو ہنسی آئی اور تھوڑی دیر کو غصہ بھی۔ یہ کون گستاخ تھا جو اس بیہودگی سے اس سے خطاب کرنے کی جرأت کر رہا تھا۔ اس کے بابو جی بٹیا نہ ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ "برجو بیٹے" ہی کہتے تھے ——— مگر یہ ———"

"اب کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے کتے۔" چوڑی پیٹھ والے نے "تے" پر زور دے کر کہا۔ "جا گلاس میں پانی لا۔"

برجو کا جی چاہا زور سے کھانسے اور غرور سے تن کر اسے بتائے کہ تم خود کہتے ! مگر ——"

"اب جاتا ہے کہ میں اٹھوں ——" بغیر دیکھے اٹھنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا گیا۔

برجو لوٹ آئی —— اسے غصہ آرہا تھا —— یقیناً پاگل تھا کوئی —— پر ماسی کے گھر میں پاگل اور انھیں پتہ بھی نہیں۔ اس نے سوچا جاکر حالات سے ماسی کو مطلع کرے اور پھر کلیجے پر پتھر رکھ کر آٹے دال کی قیمت پر بحث کر ہی ڈالے۔ مگر اس نے سیڑھیوں پر سنا "برجو تو نے دیر کی تو سر توڑ دوں گا جوتوں کے مارے، سنا، ٹھنڈا پانی لائیو۔"

اس کی جوتی لاتی تھی پانی بدتمیز کے لئے —— مگر نیچے جاکر اس نے صراحی سے پانی انڈیلا اور نہ جانے کیوں وہ دل میں ایک دلچسپ مہم کا خیال لے کر مسکراتی ہوئی چلی۔

اس نے سیڑھیوں پر سے سنا۔ "تو ہم کچل ڈالیں گے —— جب انتہا ہو جاتی —— جب . . . . ہوں —— ٹھیک۔ ہاں ظلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو مظلوم ظالم کا گلا چبا ڈالتا ہے . . . ."

برجو کو ایک پھریری سی آئی اور اس کا دل چاہا وہ فوراً لوٹ جائے۔ "گلا چبا ڈالتا ہے۔ ارے !!"

"برجو ——" ایک لمبی پکار پر اس نے جلدی جلدی چڑھنا شروع کیا۔

"کیوں ؟ کیا کنواں کھود رہا تھا —— ؟" قلم تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا —— برجو چپ کھڑی رہی۔

"جس کام کو بھیجو مر کے رہ جاتا ہے . . . . تو نے تو بس تھکا دیا۔ اور وہ خط ڈال آیا تھا —— ارے خیر —— میں پورا کر دوں گا اور بس تو نے دیر کی تو پھاڑ دوں گا سر تیرا ——"

برجو کا عجیب حال تھا، وہ چاہتی تھی ایک دم بھاگ جائے، یہ معاملہ کیا ہے؟
"اب کیا سر پہ دھرے رکھے گا میرے ـــــ رکھ دے نا یہ گلاس"۔ ہاتھ نے قلم سے میز کا کونا کھٹکھٹا کر کہا۔

برجو نے گلاس رکھ دیا اور لوٹنے لگی۔ مگر پھر رکی! کیونکہ ـــــ
"ٹھہر ـــــ یہ چلا کہاں ـــــ پھر وہی گلی ڈنڈا۔۔۔۔ ایک ملک ایک قوم ـــــ ہاں اب کے جو میں نے تجھے کلوا کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو بس ـــــ یہی ایک علاج ہے ـــــ مگر ـــــ"

برجو کا شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ کوئی پولیٹیکل پاگل ہے! دو لفظ پڑھتا ہے تو دو لفظ خود بخود بڑبڑانے لگتا ہے۔ اگر پگلی رتو ہوتی تو برجو اس سے گڑ چنے مانگ کر چھیڑتی۔ رحمان خاں ہوتے تو ان سے مرغی کے انڈوں اور پتلی دال کا ذکر کرکے تنگ کرتی۔ وہ کوئی پاگل سے ڈرتی تھی ـــــ مگر یہ عجیب و غریب پاگل، اس کا جی چاہا کہ ایک دم بھاگ کھڑی ہو۔ مگر جیسے کسی نے اس کے پیر پکڑ لئے۔

"ہاں۔ ذرا ٹھہر۔ میں پیکٹ بنا لوں ـــــ گوند ـــــ گوند کہاں گیا کتے! وہ"۔
گوند میز پہ ہی مل گیا۔ پھر سیٹی بجنے لگی اور گھٹنے ہلنے لگے۔ ناخنوں سے میز پر طبلہ بجا ـــــ سانوریا من بھایا ـــــ" بے سرے سروں میں گایا گیا۔ برجو چپ حیرت سے کھڑی سنتی رہی۔ اب اسے ذرا اور ڈر لگا۔ اس نے چاہا چپکے سے کھسک جائے مگر۔۔۔۔۔

"اور ہاں۔ یہ تو میری کیاریوں میں کیا کر رہا تھا؟"۔ برجو نے کیاریوں پر کوئی دست درازی تو کی نہیں۔ مگر پھر بھی وہ چونک پڑی۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ دیکھ لی گئی ہے۔

"میں نے تجھے کتنی دفعہ منع کیا کہ تو میری کیاریوں سے دھنیا مت توڑا کر۔ مگر جب دیکھو چٹنیاں پیس پیس کر بھکس رہا ہے۔ اب کے میں نے تجھے کیاری کے پاس سے بھی گذرتے دیکھا تو ـــــ"

قلم پھر تیزی سے چلا۔ "یہ ختم کرلوں تو دوں ——— جب تک تو مرغا بن ——— سمجھا۔"

برجو کو مرغا بننا نہ آتا تھا۔ وہ بالکل ہی نہ سمجھ سکی۔

اس کو حیرت تھی کہ یہ کیسا پاگل ہے جو بولتا بھی جاتا ہے، لکھتا بھی جاتا ہے، اور سیٹی بھی وقتاً فوقتاً بجا دیتا ہے۔ وہ بھاگ کیوں نہ کھڑی ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں لپک کر دبوچ نہ لے اور پھر ——— "چبا ڈالتا ہے ——— کچل ڈالیں گے ———" کتنا عجیب پاگل! وہ چپکے چپکے کھسکی! مگر پھر رکی! ظالم پھر گرجا۔

"اور یہ میرے سفید پھول کس نے توڑے تھے ——— بول۔ اب کے جو تو نے پھول چھوا تو بس یاد ہی کرے گا۔ آخر تو میری کیاریوں سے بھڑتا ہی کیوں ہے؟" اور پھر سیٹی بجنے لگی۔

برجو کا مارے غصہ کے منہ لال ہو گیا۔ وہ سدا سے ماسی کے یہاں آتی تھی، جتنے پھول جی میں آتا تھا توڑتی تھی۔ اور جو گملا پسند آتا لے جاتی۔ اور یہ آخر کون کمینہ تھا جو اسے منع کرنے کی ہمت کر رہا تھا۔ اسے شاید پتہ نہیں تھا کہ وہ کون ہے ——— لالہ کھیم چند کی اکلوتی بیٹی ——— اور ——— برج رانی۔ جسے کبھی کسی نے ترچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔

"کہتا ہوں لان پر مت لوٹا کر ———"

برجو نے صرف بے کار گھاس نوچی تھی!

لفافہ تیار ہو گیا۔ اور یہ بیٹھ مری۔ برجو ذرا دور کھسکی۔ وہ پچھتانے لگی۔ آخر دال آٹے کے بھاؤ میں ایسا کیا عیب تھا جو میں اس کا ذکر بھی نہ سن سکی اور اس مصیبت میں پھنسنے کو آگئی۔

"ایک بات! تو نے میرے موزے دھو دیئے۔" لفافہ پر پتہ لکھا گیا۔ برجو اور موزے دھوئے!

"بولتا کیوں نہیں ـــــ کیوں رہ گئے !!"
اور چوڑی پیٹھ دیوار کی طرف چلی گئی ـــــ اور ـــــ گھنے بالوں والا سر گھوما۔
"ارے.... آپ.... آ.... آ.... میں"۔ لفافہ جان کر گرایا گیا اور پھر اٹھا لیا

دو ایک عجیب گھبرائی ہوئی حرکتیں سرزد ہوئیں ـــــ"
"میں ـــــ برجو ـــــ وہ جانے کہاں گیا ـــــ" بے ضرورت سر گھمایا گیا۔
دروازہ کھولا اور بوکھلائی شکل کا ایک میلا سا چھوکرا ہتھیلی میں کچھ لیے ذرا ہانپتا ہوا آیا۔ برجو نے اطمینان سے ایک لمبی سانس لی اور دو انچ لمبی کھنچ گئی۔
"اوہ ـــــ" برجو کچھ کھسیانی اور بہت کچھ سٹپٹائی لوٹ پڑی۔ سیڑھیوں پر سے نیچے اترتے وقت وہ پھر چونکی۔
"کیوں بے برجواب لوٹا ہے جب کا گیا ہے ـــــ چل اب سیدھی طرح ـــــ بن مرغا ـــــ گھنٹہ بھر ـــــ" تڑسے تھپڑ کا پٹاخہ سنائی دیا ـــــ "کیوں رہ گئے"
برجو ماسی کے قریب بیٹھ کر پھر ساری کے پلو سے کھیلنے لگی۔
"اور بہن میں نے جو اچار ڈالا تھا سو بھی ساری پھپوندی لگ گئی ـــــ" برجو کی ماں بے تکان کہہ رہی تھی۔

بن بلایا مہمان

کہتے ہیں اور نگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ، ہم ہندوستانی ایسے جنگجو واقع ہوئے ہیں کہ بس بات بے بات جوتم پیزار۔ مسجد کے سامنے کافروں نے ڈھول پیٹے۔ مسلمانوں نے ڈھول پیٹنے والوں کو پیٹ ڈالا۔ مندر کے آگے تعزیئے نکلے اور لٹھ چلا۔ دراصل ہم لوگ حساس بہت واقع ہوئے ہیں ـــــ!

پیپل کا ایک شریر گدّا عین سڑک پر جھک آیا اور جب تعزیوں نے ادھر سے قدآور
چہل قدمی کی کوشش کی تو جھکنے کی ضرورت پڑی۔ تعزیے اور جھکیں! اور گدا اور بھی پیپل
کا! توبہ کیجئے اسی طرح ڈٹا رہا۔ نتیجہ ہ سینکڑوں گھر لٹ گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے
گھر پھونک دیئے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ یہ تو لمبی داستان ہے۔ مگر ہم
میں سے کون ایسا ہے جس کے لئے یہ نئی بات ہے، ہمارے پر دادا کے وقت سے لے کر اب
تک تعزیوں اور پیپل کے گدّوں کا خاندانی بیر چلا آتا ہے اور خدا نہ کرے، جو ہم اپنی قومی خوبیوں
کو خیرباد کہیں۔ اور جب مسلمانوں نے گدّا کاٹا تو اندازہ لگا لیجئے کیا ہوا۔

اور جب ہندو مسلمان لڑ رہے ہوں تو برجو ماسی جی کو دیکھنے کیسے جائے۔ گلی میں
جب "لیجیو چلیو" کا غل مچتا تو برجو کمینہ مسلمنٹو کو ان کے مظالم سے باز رکھنے کے لئے تلسی کے
پیڑ کے آگے دونوں وقت ہاتھ جوڑ کر ماتھا ٹیکتی ـــــ مگر اس دن کمبختوں نے تلسی کے گملے
کو بھی توہا تھا پائی اور دھکا پیل میں کچل کر رکھ دیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے غول بیابانی ٹڈے
پھاٹک کو پھاند کر آن پہنچا تھا۔

رات کو وہ اپنے کمرے میں آنے سے پہلے ماں سے لپٹ کر اطمینان کر لیتی کہ گھر میں
پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔ اور اس کے کمرہ کے پاس ہی گورکھوں کو تعینات کر دیا گیا ہے۔
پر کوئی رات کے گیارہ بجے، جبکہ خواب میں پھٹے کپڑوں والے زخمیوں کو گلیوں میں گرتا پڑتا
دیکھ رہی تھی ایک دم اس کی آنکھ ایک غیر معمولی کھٹکے سے کھل گئی اور ایک بھیانک سایہ
دھندلکے میں کھڑکی میں سے داخل ہوتے دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس سے قبل کہ اس
کی چلانے کی طاقت عود کر آئے وہ بھیانک سایہ اس کے اوپر جھک کر عجب طرح غرایا کہ
وہ سہم گئی۔

"خبردار جو..." برجو بستر میں دبک گئی۔ نیچے بے طرح غل مچ رہا تھا۔ شاید
کوئی شکار گلی والوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے کمرہ میں پناہ لینے آیا تھا... لیکن ـــ

اگر وہ اسے قتل کرنے آیا تھا تو ؟ وہ پھر چیخنے لگی۔ سائے نے فوراً اپنے کھردرے سخت ہاتھوں سے اس کا منہ بھینچ دیا۔

"تم چیخو گی تو ـــــ میں تمہارا گلا دبا ڈالوں گا ـــــ سمجھیں ـــــ وہ مجھے مارنے آرہے ہیں ـــــ مار ڈالیں گے ـــــ کمینے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور گرفت ڈھیلی کر دی۔

برجو بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

"تم بڑی ڈرپوک ہو۔" مخاطب کے لہجہ میں ہنسی کا شائبہ تھا۔

"تم ـــــ ہو کون ؟"

"میں کوئی بھی ہوں .... وہ لوگ مجھے مارتے آرہے ہیں .... خدا کی پناہ.... شاید انھوں نے مجھے آتے دیکھ لیا۔" اس نے ذرا اٹھتے ہوئے کہا۔ گلی میں غل سنائی دے رہا تھا۔

اندھیرے میں اسے بولنے والے کا نقشہ تو نظر نہ آیا ـــــ مگر "خدا کی پناہ" سے وہ پہچان گئی کہ کوئی مسلمان ہے ـــــ بعض وقت خدا کا نام لینا بھی آفت میں پھنسا دیتا ہے۔

"تم نکل جاؤ میرے کمرے سے .... ابھی ...." وہ پیچھے کھسک کر اٹھنے لگی۔

"ابھی ـــــ ؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "اس ـــــ حالت میں ـــــ توبہ کرو وہ مجھے ....."

"ہاں اس حالت میں ـــــ" برجو اسے دبتا دیکھ کر بہادر بنی۔

"خوب !" اس مصیبت میں بھی اسے خوش مذاقی سوجھ رہی تھی۔ "اور جو وہ مجھے کتے کی موت مار دیں تو پھر ـــــ آپ ـــــ آپ کا کیا جائے گا۔"

"میں ـــــ میں۔" وہ شاید کسی کو پکارنے کی دھمکی دینے والی تھی۔

"اگر آپ چلائیں تو مجھے مجبوراً آپ کے نازک گلے کو اپنے کریہہ ہاتھوں سے گھونٹنا پڑے گا۔ میں کہتا ہوں آپ ڈرتی کیوں ہیں۔ میں کوئی ہوّا تو نہیں ہوں جو آپ کو کھا جاؤں گا۔ چپکی پڑی رہئے۔"

"آپ کو اس طرح میرے کمرہ میں آنے کا کیا کوئی ——"

"بالکل نہیں —— قطعی نہیں۔ مگر سنئے تو —— میرے پیچھے چاودڑی سے ڈیڑھ سو کے قریب لفنگے لگے ہوئے ہیں —— نہ جانے کیسے کیسے گھنٹہ بھر سے بھاگم بھاگ یہاں تک آیا ہوں اور مجبوراً مجھے آپ کے دولت خانہ میں بغیر اجازت کے گھسنا پڑا —— یقین مانئے مجھے رات کے بارہ بجے آپ جیسی حسین چھوکریوں کے کمروں میں گھسنے کی قطعی عادت نہیں —— ہاں —— اور میں ذرا دیکھوں تو آپ کہاں ہے آپ کا —— وہ آپ کی بجلی —— ذرا جلائیے تو ——"

"بالکل نہیں۔ آپ نکل جائیے یہاں سے ورنہ ——" برجو نے ذرا تن کر کہا۔

"ورنہ ؟—— ورنہ کیا ؟" آنے والے نے بجلی کے بٹن کو تلاش کرنا شروع کیا۔

"ورنہ یہ کہ میں ابھی . . . ."

"کسی کو بلالیں گی! یہی نا ؟"

"ہاں"

"پھر ؟"

"پھر . . . . پھر . . . . تم . . . ."

"کتے کی طرح آپ کے کمرے میں ذبح کر دیا جاؤں گا۔"

میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کرنے پر برجو کی حیرت کی انتہا نہ رہی "کیوں بے کتے ؟" اس کے دماغ میں گونجنے لگا۔ ماسی کے گھر والا دیوانہ انسان۔ خون اور کیچڑ میں لتھڑا، چیتھڑوں میں ملبوس، ہاتھ میں ایک حقیر سی چھڑی لئے لیمپ کی روشنی نے

گھبرائی ہوئی آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ رشید اس کی ماسی کا بیٹا۔ وہ کچھ متحیر اور کچھ خوف زدہ اپنے کو ساری میں لپیٹتی ہوئی پلنگ کے دوسری طرف کھڑی ہو گئی۔

"کیا آپ پسند کریں گی کہ آپ اس وقت باہر گلی میں چلی جائیں"۔ اس نے شاید برجو کو نہ پہچانتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ میرے کمرے میں رہیں"۔

"اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی بوٹیاں بخوانے باہر چلا جاؤں"۔

"آپ بڑے بزدل ہیں؟"

"ہیں میں؟ مگر ذرا سوچئے تو ــــ میں نے ــــ میں کس طرح اتنے درندوں سے لڑ سکتا ہوں"۔

"میں کیا جانوں"۔

"لیجئے وہ ــــ شاید وہ پھر آگئے"۔ شکار نے احاطہ میں غل سن کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" برجو نے گھبرا کر کہا۔

"شاید دروازہ بند کر رہا ہوں"۔ اس کے لہجہ میں ایک تلخ تبسم جھلک رہا تھا۔ "اور پھر . . ."

"میں ــــ آپ کو ابھی ان کے حوالے کر دوں گی"۔ برجو نے جھلا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"کیا آپ نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے مر جانا چاہئے؟" بن بلائے مہمان نے ذرا طنز سے کہا۔

"یہ میں نہیں جانتی"۔ برجو نے ذرا تکلف سے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے ــــ میں یہیں مروں گا؟" اور وہ کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

برجو ٹھٹکی۔ "تمھیں باہر جانا پڑے گا"۔ اس نے رعب سے کہا۔

"مرنے کے لئے نا؟ خوب! ـــــ جی نہیں میں یہیں اسی جگہ مروں گا ـــــ تاکہ آپ دیکھیں کس طرح میری گردن میں سے خون کے شراٹے نکلتے ہیں۔ بھئی جہاں میرا دل چاہے گا وہیں مروں گا۔ نہ کہ آپ کے حکم کے مطابق"۔

برجو نے پھریری لی۔

"اور تازہ تازہ خون! لال لال! یہاں بہے گا"۔ اس نے اپنے چاروں طرف اشارہ کیا۔

"مگر ـــــ"۔ برجو لوٹ پڑی۔

"اگر نا مگر ـــــ اور پھر، میں بھوت بن کر آپ کو ـــــ آپ کو ـــــ بس سمجھ لیجئے خوب! ـــــ"

"آپ کمرے سے چلے جائیے"۔ برجو کچھ لاچار سی ہو گئی۔

"جی نہیں ـــــ اب تو آپ دیکھیں ـــــ آپ نے کبھی بکرے کٹتے دیکھے ہیں۔ کچا کچا گوشت کا قیمہ بنتے ہڈیوں کا چورا ہوتے دیکھا ہے"۔ کمزوری سے فائدہ اٹھایا گیا۔

برجو نے دو دفعہ قصائی کی دکان دیکھی تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"اور میرا سر وہ اینٹوں سے پھوڑیں گے ـــــ میرا بھیجا یہاں ـــــ اور کیا عجب یہ سب آپ کی خوبصورت چیزیں میرے خون سے لتھڑ جائیں۔ بہتر ہو کہ ذرا آپ اپنا سامان وغیرہ کھسکا لیں۔ کیونکہ وہ لوگ مجھے آسانی سے ذبح نہ کر سکیں گے۔ وہ گھمسان کی لڑائی ہو گی یاد رکھئے ـــــ آپ مجھے بزدل کہتی ہیں۔ چار کو مار کر مروں گا"۔

"آپ ـــــ بڑے عجیب آدمی ہیں"۔ برجو مجبور ہو کر مڑ گئی۔

"کیا سمجھتی ہیں آپ؟ ـــــ سمجھا کیا تھا آپ نے مجھے ـــــ" اکڑ کر سینہ تانتے ہوئے کہا گیا۔ "دیکھئے گا آپ خون کا دریا بہہ جائے گا۔ بس خون ہی خون! چھ سات لاشیں گریں گی ـــــ" احاطہ میں غل بڑھتے دیکھ کر عجیب و غریب پاگل بولا۔

برجو دروازے کے قریب گئی تو اسے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں، بلوائی شاید شکار کو نوکروں کے حصہ میں ڈھونڈنے کے بعد خاص مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گو وہ کچھ اتنے بڑے انبوہ کو سنبھالنے میں ذرا مشکلات محسوس کر رہے تھے۔

"وہ مکان میں تلاشی لینے آرہے ہیں"۔ برجو نے گھبرا کر کہا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس بے فکر انسان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

"آپ کو مجھے چھپانا ہوگا"۔ اس نے برجو پر دباؤ ڈالا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"میں کہیں آپ کو نہیں چھپاؤں گی"۔ برجو غصہ سے تن گئی۔

"جلدی کرو ——" اور اس نے برجو کے کندھے جھنجوڑ ڈالے۔ تمھیں معلوم نہیں میں مرنا پسند نہیں کرتا"۔

"تم کمینے ہو"۔ وہ جھٹکے سے دور کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ غیر فیصلہ کن انداز میں کھڑا رہا۔ برجو نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے جسم اور چہرے پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔ گریبان نیچے تک پھٹا ہوا تھا اور ایک ٹانگ بالکل برہنہ تھی۔ باوجود سردی کے وہ پسینہ میں نہایا ہوا تھا۔ پریشان بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اگر وہ اتنا گندہ نہ ہوتا تو اچھی خاصی شکل تھی۔

"تم واقعی چاہتی ہو کہ میں مارا جاؤں .... ذرا سوچو اگر تمھارا اکلوتا بیٹا اس طرح بلا میں پھنس جاتا تو تم کیا اسے ان درندوں کو دے دیتیں تاکہ وہ اس کی بوٹیاں چبا ڈالیں"۔ اسے دروازہ کی طرف کوئی آتا معلوم ہوا۔ لپک کر اس نے بجلی بجھا دی اور مضبوطی سے برجو کے کندھے گرفت میں لے لئے۔

"اگر تم بولیں تو میں ——" اس نے خوفناک طریقہ پر دانت بھینچ کر کہا۔ "تمھیں بھی میرے ساتھ مرنا ہوگا —— سمجھیں"۔

"اچھا ـــــ اس پردے کے پیچھے چھپ جاؤ ـــــ" برجو مجبور ہو کر بولی۔ وہ خون خنجر کے خیال سے لرز گئی۔ آنے والے نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"بی بی" کسی نے ڈری آواز سے پکارا۔

"بالکل خاموش!" گھٹی ہوئی تاریکی میں برجو نے سنا اور کندھوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

"چھپ جاؤ ـــــ پرماتما کے لئے چھپ جاؤ" اس نے اجنبی دیوانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بی بی ـــــ لوگ آرہے ہیں ـــــ" اور ساتھ ساتھ غل بالکل برامدے میں سنائی دیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ انھوں نے ایک آدمی اسی سمت آتے دیکھا تھا۔

"چلو ـــــ میں تمھیں ادھر چھپاؤں گی" لیکن جیسے وہ کچھ سن ہی نہیں رہا تھا: کیوں کہ وہ بت کی طرح کھڑا رہا۔

"چلئے" اس نے ذرا التجا آمیز طریقے پر اسے ڈھکیلا۔

"نہیں ـــــ تم کہتی ہو میں بزدل ہوں ـــــ میں تمھیں دکھاؤں گا ذرا دروازہ کھول دو ـــــ" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"نہیں ـــــ یہ کیا کرتے ہو، وہ تمھیں مار ڈالیں گے"۔

"بلا سے"۔ اور وہ اسے ڈھکیلتا آگے بڑھا۔

"دیا کیجئے ـــــ پرماتما کے نام پہ" وہ اسے روک کر بولی۔

"کیوں؟"

"میں خون نہیں دیکھ سکتی"۔

"ہوں، بڑی خود غرض ہیں آپ! اچھا آپ چلی جائیے ـــــ اور مجھے ـــــ"

"نہیں، میں آپ کو مرنے نہیں دوں گی۔ جلدی کیجئے۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم میں

بھی ڈھونڈ چکے۔ اب ادھر ہی آ رہے ہیں"۔

"میں نے کہہ دیا کہ میں دکھا دوں گا آپ تو۔ یقیناً خوش ہو جائیں گی آپ۔ ہاہا"۔

وہ بیدردی سے ہنسا۔

"میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں"۔ برجو سسکیاں بھرنے لگی۔

"یہ خوب زبردستی ہے!" اس نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح کہا اور برجو اسے گھسیٹتی ہوئی پردے کے پیچھے لے گئی۔

"خاموش، اگر آپ ذرا ہلے تو وہ دیکھ لیں"۔ اس نے اس کے کان کے قریب کہا۔

پردہ برابر کر کے اس نے لیمپ جلایا اور جلدی جلدی اس نے وہ کیچڑ اور مٹی جھاڑ دی جو کہ فرش اور قالین پر لگ گئی تھی۔ جلدی سے کھڑکی بھی بند کر دی اور ایک گلدان اور چند کتابیں اٹھا کر وہاں رکھ دیں۔ تاکہ کوئی سمجھے کہ کھڑکی کھلی ہی نہ تھی۔

"کون ہے"۔ اس نے دروازہ کھولا۔

دروازے پر اس کی آیا کھڑی کانپ رہی تھی اور اس کے پیچھے اس کی ماں دوڑی آتی دکھائی دی۔

"بی بی وہ لٹیرے آ گئے ـــــ ناس جائے ان کا۔ کہتے ہیں کوئی مسلمان آپ کے کمرے میں آ گیا ہے"۔

"میرے کمرے میں ؟" برجو بن کر بولی۔

"ہاں۔ انھوں نے اسے دیوار پر چڑھتے دیکھا ـــــ اور ـــــ اے لو وہ آ بھی گئے ـــــ آگ لگ جائے ان کو"۔ ماں انھیں کوسنے لگی۔

تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہوا کہ برآمدہ نہیں کناری بازار ہے اور وحشیوں کی سی ہیئت کی چند قحط زدہ شکلیں دروازہ میں نظر آئیں۔

"کیا ہے ؟" ایک مہارانی کی سی شان سے برجو آگے بڑھی۔

"کچھ نہیں ـــــ شریمتی جی ایک ملچھ آپ کے کمرے میں ہم نے آتے دیکھا ہے۔
" میرے کمرے میں؟" برجو نے حیرت سے انھیں داخل ہونے کا راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں" ۔ اور بہت سی عجیب عجیب شکلیں آگے آئیں۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں انھیں سوائے چند سحر کن اشیاء کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ وہ لوگ حیرت سے ان عجیب و غریب کرسیوں اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو گھورنے لگے۔ تھوڑی دیر کے لئے تسکار کو بھول گئے جو شاید غور سے سنتے تو سانس کی آواز سن لیتے۔

"یہاں کون آتا" برجو نے دل میں لرزتے ہوئے کہا۔

"یہاں کون آتا" اس میں سے شاید ان کا لیڈر بولا۔

"کوئی بھی نہیں" سٹھانی نے اطمینان سے کہا۔

ذرا نا امید ہو کر جاتے ہوئے بلوائی یقین دلا گئے کہ وہ محض قومی ہمدردی سے مجبور ہو کر ایک دشت سے انھیں بچانے آئے تھے۔

اس کی ماں بے طرح گبھرائی ہوئی تھی اور اسے مجبور کیا کہ وہ چل کر اس کے پاس سوئے یا کم از کم اپنی آیا کو تو پاس سلا ہی لے ـــــ!

برجو نے ہنس کر اسے یقین دلایا کہ وہ قطعی نہیں ڈر رہی ہے۔ ڈرنے کی ایسی بات ہی کیا تھی۔ وہی لوگ تھے ـــــ اس نے اپنے حسین کمرے میں آیا کی گودڑی آنے کے تصور کا مذاق اڑا کر بہانہ بنا دیا۔ آیا اسے گذرے زمانہ کی باتیں یاد دلا کر رعب جمانے لگی۔ برجو ننھی سی تھی اور اسی گودڑی میں کس مزے سے سوتی تھی۔

"اب میں بڑی ہو گئی ہوں"۔ وہ ہنسی۔

دروازہ بند کر لینے کی سخت تاکید کر کے اور "دشمنوں" سے بچے رہنے کی دعا دیتی ہوئی بھولی بھالی آیا کے جاتے کے بعد برجو پردے کی طرف مخاطب ہوئی۔ جس کے نیچے میں

ایک مسخرہ چہرہ مسکرا رہا تھا۔

"اب تم فوراً چلے جاؤ"۔ اس نے اپنی پہلی سختی سے کہا۔

"ہوں!"۔ اور وہ نہایت اطمینان سے اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سنا نہیں؟ اب جانا چاہئے تمھیں"۔

"اوہ ذرا ــــ"

"نہیں اب تم ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے"۔

"نہیں جاتا میں بلالوں ان جنگلیوں کو۔ تم سے تو وہی بہتر تھے"۔ اس نے بے بات جھلانا شروع کیا۔

"تمھیں بات کرنا نہیں آتی"۔

"اور تمھیں کون سی بات کرنا آتی ہے۔ ایک پٹے پٹائے بھوکے پیاسے انسان سے یہی سلوک کیا جاتا ہے؟"۔

"اوہ ــــ اچھا مگر اس وقت تو تمھیں بھوکا ہی جانا ہوگا"۔

"تو بلالو انھیں ۔ ۔ ۔ ۔ بہتر ہے وہ مجھے مار ڈالیں"۔ اس نے غصہ سے دانت پیس کر کہا۔ "یہ نہیں دیکھتیں ــــ" اس نے اپنی کہنیاں اور خون آلود گھٹنے دکھا کر کہا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے"۔ وہ پانی لینے چلی۔

"اور کیا، ہونا ہی چاہئے"۔ اس نے بڑبڑانا شروع کیا۔

لوٹا برجو کے ہاتھ سے لے کر پہلے تو اسے پی کر بالکل خالی کر دیا اور پھر مانگا۔

"کبھی کسی نے تمھیں لڑکیوں سے بات کرنا نہیں سکھایا۔ ادھر لاؤ اپنا بازو"۔ برجو نے کپڑے میں سے زاید پانی نچوڑ بزرگانہ لہجہ سے کہا۔ مگر اسے ترس آرہا تھا۔

"ہونہہ ــــ کوئی کیا بات کرنا سیکھے ــــ تم لوگ خواہ کیسی ہی بہادر ہو۔ جہاں کوئی اجنبی آیا اور تم لوگ نئے تیتر کی طرح بھڑکیں۔ کہو بھلا میں خود مصیبت میں

دیکھا اور اپنی جان، ہتھیلی پر رکھ کر پہنچے۔ اگر تم اس وقت اس طرح گھر جاتیں تو یقین مانو جان دینے میں بھی مجھے عذر نہ ہوتا۔ مگر تم.....!"

"دکھتا تو نہیں ہے؟" برجو نے بات بدلنے کے لئے زخم کو کپڑے سے چھو کر کہا۔

"قطعی نہیں ربڑ کا بنا ہوا ہوں۔"

برجو ہنسنے لگی۔

"اب تو جانے میں کوئی عذر نہیں ہے؟" خون پونچھنے کے بعد کہا۔

"اس طرح ہے؟" اس نے اپنے چیتھڑوں کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہا۔

"تو میری ساڑھی اور جمپر پہن جاؤ۔" وہ بستر پر بیٹھ کر ہنسنے لگی۔

"تمھیں کسی نے لڑکوں سے بات کرنا نہیں سکھایا۔" اس نے طعن سے دہرایا۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ برجو کی سفید ساری کو آدھا اوڑھے اور آدھا لپیٹے جانے کے لئے تیار ہو گیا اور کھڑکی کھولنے لگا۔

"ادھر سے ہے؟"

"اور نہیں تو پھر کدھر سے۔ تم سمجھتی ہو میں تمھارے گھر کے کونے کونے سے واقف ہوں" اس نے نہایت برا مان کر کہا۔

"پھاٹک سے نکل جاؤ۔"

"گور کھے!"

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔

"ماں کو خبر دینی ہوگی۔"

"تم جانو ــــ دیکھو مارا گیا تو ــــ"

"چپ رہو۔"

"مگر سنو تو ــــ ادھر تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔" اس نے کھڑکی کھول کر جھانکتے

ہوئے کہا۔

اور دوسرے لمحے وہ سنسان گلیوں میں سمٹتا بچتا چلا جا رہا تھا۔

بچہ

فساد بڑھتا گیا۔ گورنمنٹ نے دونوں پارٹی کے ممبروں کو بغیر تحقیق جیل میں ٹھونسنا شروع کیا۔ مارنے والا اور پٹنے والا دونوں گئے۔

اسی ہنگامہ میں رشید کو پھر اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے نکلنا پڑا۔ شہر کے گلی کوچوں میں معلوم ہوتا تھا سنیما کے سین دکھائے جا رہے ہیں۔ سنسان گلی میں ایکدم بھگدڑ پڑ جاتی تھی۔ اور پھر وہی موت کی سی خاموشی۔ جھگڑے فساد کے میدان میں ہی رشید ایک ننھے سے ننگے دھڑنگے بچے کو بلوائیوں کے پیروں سے کچلنے سے بچا کر ادھر ادھر سے بچتا اپنے گھر پہنچا تو ایک اور ہی مصیبت آن پڑی۔ ایک تو ماں بیمار اوپر سے بچہ کا پالنا۔ نوکر بلوے کے سلسلہ میں نہ جانے کہاں اڑے ہوئے تھے۔ گھر پر ایک تباہی چھا گئی تھی۔ جھاڑو دینے اور کھانا پکانے اور ماں کی تیمارداری کرنے میں رشید کا دماغ لوٹا جاتا تھا۔ اور جب سے بچہ آیا تھا اس کے اور بھی حواس گم تھے۔ اسے نہلانے دھلانے میں اسے قیامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بچہ صرف گھٹنیوں چلتا تھا۔ اور کچھ کھا بھی نہ سکتا تھا۔ وہ چار چار دفعہ بچے کو بالکل ایک گلاس کی طرح کھنگال ڈالتا۔ اور پھر بھی میلا ہی رہتا۔ نہلانے میں نہ جانے کتنی دفعہ صابن ہاتھ سے پھسلتا۔ کتنی دفعہ بچہ لوٹا اوندھا دیتا اور کتنی ہی مرتبہ خود بچہ ہاتھ سے پھسل کر موری میں جا پڑتا۔

اور پھر اسے کپڑے پہنانا بس ـــــ خدا کی پناہ ـــــ رشید نے اپنے سارے بنیان اسے پہنا ڈالے۔ پھر تکیئے کے غلافوں کی باری آئی اور آخر میں اس نے اسے چیتھڑے پہنا کر اوپر سے دھجیوں کی مدد سے ایک کرتے کی شکل میں جسم پر باندھ دیا۔ اس کے کمرے میں میلے اور

گیلے کپڑوں کے انبار میں بچہ کھیلا کرتا۔ وہ بے چین تھا کہ کب بلوہ ختم ہو اور وہ اس فتنہ کو اس کے ماں باپ تک پہنچا دے۔ مگر ایک بات ہے کہ اس کی خشک کتابوں کی زندگی میں بچہ نے ایک دلچسپ ہلچل مچا دی اور اس کا کام کرنے میں اسے گونہ دلچسپی ہوتی تھی۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ الٹی سیدھی حرکتیں کرتا اور بچہ بھی بہت مانوس ہو گیا تھا۔ کبھی وہ اس سے نہایت سنجیدگی سے کھانا پکانے اور اس رات کے واقعہ پر ایک طرفہ بحث کیا کرتا تھا۔

بلوہ دب گیا اور گلی کوچے گذرنے کے قابل ہو گئے گو سینکڑوں گھر لٹ گئے اور یتیموں کی تعداد دو گنی ہو گئی۔

رشید نے بچے کو کسی یتیم خانہ میں دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ اسے بھڑک پر لے کر "پائی پیز برائی چیز" کے نعرے تو لگا نہیں سکتا۔ اسے کچھ افسوس سا ہوا جب وہ بچہ کو ایک تولیہ میں لپیٹ کر یتیم خانہ لے گیا۔

"اس کے ماں باپ کون تھے؟" مہتمم یتیم خانہ نے پوچھا اور رشید کی لاعلمی ظاہر کرنے پر صاف کہہ دیا "جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یہ بچہ کسی ہندو کا ہے ہم اسے ہندو یتیم خانہ میں نہیں رکھ سکتے۔ ویسے ہی شہر میں بلوہ ہو چکا ہے اور ابھی ہندو مسلمان کسی طرح بھی ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔"

رشید کو غصہ تو آیا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کسی مسلم یتیم خانہ میں دے آئے۔ مگر اس کی حیرت اور غصہ کی انتہا نہ رہی جب ان لوگوں نے اسے مفسدوں کے گروہ کا نمائندہ بتا کر کہہ دیا کہ وہ ان چالوں میں نہیں آئیں گے۔ یتیم خانوں کا معاملہ ہے، اگر پھر بلوہ ہو گیا تو یہ معصوم بھی پھنس جائیں گے۔

رشید گھبرا کر بے جواب دیئے باہر نکل آیا اور اس نے بچے کو لے کر ایک طرف چلنا شروع کیا۔

"اچھا مسٹر اب صاف صاف بتا دو کہ تم ہو کون بلا؟" اس نے بچے کو پل کی منڈیر پر بٹھا کر پوچھا۔

بچے نے ہنس کر ایک تھپڑ مار دیا۔

"اے ـــــ میں کہتا ہوں مولانا یہ مذاق کا وقت نہیں۔ بہتر ہے آپ سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور صاف صاف اپنی ولدیت، مذہب اور ذات پات سے خاکسار کو آگاہ کریں"۔ اس نے سنجیدگی سے تھپڑ کی زد سے بچ کر کہا۔

"غوں ـــــ اوں"۔ بچہ ہنستا رہا اور اس کے بٹن کو دانتوں سے پکڑنے کے لئے زور لگانے لگا۔

"اوہ ـــــ آپ نہیں سمجھتے؟" اور وہ بچے کو اٹھا کر چلنے لگا۔ یہ تو ناممکن تھا کہ وہ بچے کو خود پالنا شروع کر دے۔ گو اب نوکر بھی واپس آگیا تھا۔

وہ دیر تک چلتا رہا۔

"کیوں نہ جس کا مال ہو اسے ہی دے دیا جائے"۔ اس نے بچے کو سڑک کے کنارے بٹھانے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ اترنے پر تیار نہ ہوا۔ رشید کو یقین تھا کہ اگر وہ اس طرح بچے سے چھٹکارہ پا جائے تو اسے کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لے جائے گا۔ اس نے بہلا پھسلا کر سگریٹ کا ڈبہ اور کاغذ وغیرہ دے کر ایک سنسان سڑک کے کنارے بٹھا دیا۔

اور خود آہستہ آہستہ آگے چلا۔

"ڈاڈا"۔ بچہ بولا۔ اس کے پاؤں رکے، پھر بڑھا ـــــ بچے نے منہ بسورا۔

"حضرت میں آپ سے ڈرتا نہیں"۔ اور وہ دو قدم اور بڑھا۔

"ہاہا"۔ بچہ رونے لگا۔ رشید کے قدم کسی نے دو سکنڈ کے لئے روکے ـــــ مگر وہ پھر بھی چلتا گیا۔ اس نے بچے کے رونے کی آواز سے بچنے کے لئے دونوں کان بند کر لئے اور لمبے لمبے ڈگ مارتا چلا ـــــ بچہ اب بھی رو رہا تھا۔ رشید رکا ـــــ واپس مڑا۔ پھر چل

دیا ـــــ پھر مڑا۔ اور تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ پھر چل دیا ـــــ مگر اب کے اس سمت جدھر سے بچے کی رحم طلب معصوم آواز آرہی تھی۔

رشید نے غصہ ہو کر اسے اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر غور سے اسے گھورا۔ بچہ پھر بسورا، رشید خاموش چلنے لگا۔ بچہ اسے تھوڑی دیر ایسے دیکھتا رہا، جیسے روٹھی ہوئی ماں کو دیکھتا ہے۔ پھر ننھا سا ہاتھ ہوا میں اٹھا اور پورے زناٹے سے رشید کی کنپٹی پر پڑا۔

"بڑے بد مذاق ہیں آپ ؟" رشید نے ہنسی روک کر کہا۔

دوسرا تھپڑ۔

"اچھا ـــــ اچھا معاف کریئے"۔ اس نے بچے کو کلیجہ سے لگا کر کہا۔

○

پھر وہی بچہ وہی بیماریاں اور گھر! لیکن اب وہ اتنا سونا نہ نظر آتا تھا۔ وہاں ہر وقت ایک بچے کی کلکاریاں اور ایک نیم پاگل انسان کے قہقہے گونجا کرتے۔ رشید نے اسے پولیس کے سپرد کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر وہ انتظار کر رہا تھا نہ جانے کس کا ؟ جب پولیس کو دینا ہی ہے تو پھر دو دن گیا اور چار دن گیا ؟ اور دوسرے اسے بچے کو دینے کے لئے کوئی نہایت موزوں وقت بھی تو نہیں ملتا تھا۔

○

پھر ایک دن برجو اپنی ماں کے ساتھ آئی تو اسے بچہ بڑا دلچسپ نظر آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایسے بن گئے گویا کبھی پہلے ملے ہی نہیں ہیں۔ برجو نے پہلے تو بچے کے بے ڈھنگے کپڑوں کا مذاق اڑا کر رشید کو خوب جلایا۔

"ہونہہ بچے کا پالنا بھی کوئی کمال ہے ؟" اس نے غرور سے جواب دیا۔

"میں اسے پندرہ روز سے بڑے مزے سے پال رہا ہوں"۔

"پندرہ روز سے پال رہے ہیں ؟ پندرہ روز ؟ کیا کہنے ہیں آپ کے"۔ برجو ہنستی

رہی۔" اور جیسا آپ پال رہے ہیں وہ خوب نظر آرہا ہے ——— یہ ——— یہ ——— دیکھئے واہ۔" اس نے بچے کے کرتے کا مذاق اڑایا اور بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹنے لگی۔

"آپ تکلیف نہ کریں میں اسے نہلا کر ابھی سب کچھ ٹھیک کرلوں گا۔" اور وہ اسے بڑی احتیاط سے نہلانے لگا۔

برجو کی معترض نگاہوں کے آگے رشید کے آئے حواس چل دیئے کئی دفعہ بچہ پھسلا اور خود رشید کے کپڑے کیچڑ اور پانی میں ڈوب گئے۔ برجو ہنستے ہنستے لوٹ گئی جس پر رشید اور کھسیانہ ہوگیا۔ جب بچے کی آنکھوں میں صابن لگا تو برجو سے نہ رہا گیا اور بے چین ہو کر بڑھی اور بچے کو لے لیا۔

"ہٹیئے آپ تو مار ہی ڈالیں گے بچارے کو۔"

"ہونہہ۔ یعنی اتنے دن سے ———"

"اوہ موا تو کر دیا۔" برجو نے بچے کو سلیقہ سے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو گویا آپ بڑی ماہر ہیں۔ دیکھیں تو آپ کیا کمال دکھاتی ہیں۔" رشید نے اپنے کپڑے نچوڑتے ہوئے ایک طرف ہو کر کہا۔

برجو نے بچے کو نہلا کر بدن پوچھنا چاہا تو رشید بے طرح گھبرا گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کر اپنی قمیص کھونٹی پر سے اتاری۔ کیونکہ کل چادریں اور تولئے کیچڑ میں بھرے کونے میں پڑے تھے۔

"قمیص سے؟" برجو نے پریشان کر کہا اور رشید سر کھجانے لگے۔

"لائیے وہ میز پوش!" برجو نے معاملہ کو سمجھ طعن سے مسکرا کر کہا۔ جب بچہ نہا چکا تو رشید تازہ دھلا ہوا بنیان لئے بڑے مستعد کھڑے تھے۔ برجو نے صرف نفرت سے بنیان دور پھینک دیا اور بچے کو اسی تولئے میں لپیٹ کر کھڑی ہوگئی۔

"میں آج ہی اسے دے آؤں گا۔ رشید نے شکست خوردہ لہجہ میں کہا۔ اور اداس

ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ اسے مجھے دے دیجئے"۔

"آپ کو ــــ آپ کیا کریں گی ــــ میں تو پولیس میں دے دوں گا۔ وہ اسے پہنچا دیں گے اس کے گھر"۔

"اچھا تو ابھی چلئے ــــ جب تک اس کے ماں باپ ملیں پولیس سے کہہ کر میں رکھوں گی"۔

"آپ کیوں یہ دردِ سر مول لیتی ہیں"۔

"یہ دردِ سر نہیں"۔ برجو نے اونگھتے ہوئے بچے کو پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

○

پولیس بچے کے ماں باپ کا پتہ کبھی نہ لگا سکی۔ مصیبت کے مارے بلوے کی نذر ہو چکے ہوں گے۔ برجو کا سارا وقت بچے کی دیکھ بھال میں گذرنے لگا۔ رشید وقتاً فوقتاً بچے کو دیکھنے آتا اور دونوں میں کبھی کبھی جھگڑا بھی ہو جاتا۔ بچہ برجو سے ایسا مانوس ہوا کہ رشید کی ساری خوشامدوں کا جواب صرف منہ موڑ کر دیتا۔

برجو اور رشید میں بچے کی طرزِ پرورش پر کبھی حجت ہوتی۔ وہ کہتا کہ یہ فراکیں لڑکوں کو پہنا کر عورتیں مردوں کی جنس پہ چوٹ کرتی ہیں اور برجو اسے وہ تکیے کے غلاف اور بنیان یاد دلا کر شرمندہ کرتی۔ جو وہ کبھی بچے کو پہنایا کرتا تھا۔

رشید بچے کو خوب چھیڑتا اور رلاتا۔ جس پر برجو بگڑ جاتی۔ وہ اسے ہمیشہ برے ناموں سے پکارتا۔ اور برجو کی فرمائش تھی کہ سینما کے مشہور ترین ہیرو کے نام پر اس کا نام رکھے۔ وہ بچے کو پیاری پیاری لوریاں سناتی تو رشید بالکل اس کا الٹا کر کے برجو کو چھیڑتا اور وہ کبھی بگڑ جاتی۔

"آپ ہوتے کون ہیں۔ میرا جی چاہے جو کچھ کروں۔ میرا بچہ ہے ــــ!"

"خوب! اور کیا میرا بچہ نہیں ہے؟ آپ کو بگڑنے کا کیا حق؟"

"یہ میں کب کہتی ہوں کہ آپ کا نہیں" بھول پن سے برجو بولی۔ "دونوں کا ہے"۔

"دونوں کا؟" رشید نے امید و بیم کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر پوچھا۔

برجو کا سر جھک گیا ــــ اور وہ بچے کو لے کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

O

قوم نے پھر جاگنا شروع کیا۔ بہت جلد چند معزز ہستیوں کو پتہ لگ گیا کہ ایک "مسلمان" بچہ ہنود کے یہاں پرورش پا رہا ہے۔ ہندوؤں کو بھی فوراً اس بچہ کی حمایت میں اٹھنا پڑا۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ بچہ کسی اونچی ذات کا ہندو ہے۔ دونوں کا خوف اور "اسلام خطرہ" میں ہونے کا خیال ظاہر کیا گیا۔ قوم کے سب سے بڑے خدمت گار یعنی ایڈیٹر گلا پھاڑ پھاڑ کر اٹھنے لگے۔ اور پھر جلسے ہوئے جن میں اس بچے کے مذہب کے خطرے میں ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی تباہی کے آثار نظر آنے لگے۔ وہی بچہ جسے ہندو مسلمان دونوں نے دھتکار دیا تھا۔ اگر اپنی اور ہم انجام ہستیوں کی طرح سڑک پر کتوں کے ساتھ جھوٹے ٹکڑوں اور چھوڑی ہڈیوں کے پیچھے لڑ کر کسی روز خاموشی سے سڑک پر ہی آخری سانس لے لیتا تو کچھ نہ تھا۔ پر یوں اس کے دھرم کی گت اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر کے مذہب کا زوال یقینی تھا۔ بھلا کس سے دیکھا جاتا۔ معاملہ اور بڑھا۔ دونوں فریقوں نے لاتعداد گواہ اس بچے کے مذہب کو ثابت کرنے کے لئے مہیا کر دیئے۔ مگر رسی کھنچتی ہی رہی۔ دونوں طرف زور شور سے چندے جمع کئے جانے لگے۔ اور باقاعدہ فنڈ قایم ہو گئے۔ جو شاید کسی زلزلہ زدہ شہر کے لئے کبھی نہ کئے جاتے اور جبکہ نہ جانے کتنے ہی معصوم مذہب سے دور جن کا دھرم صرف غربت تھی۔ فاقہ کشی میں گھرے ہوئے تھے لاکھوں روپیہ وکیلوں اور گواہوں کی جیبوں میں انڈیلا جا رہا تھا۔ یہ تو ہوئی ایک ملک کی مذہب پرستی۔

جو کبھی فیصلہ ہندوؤں کے موافق ہوتا تو فوراً اسلامی جھنڈے ہوا میں لہرانے لگتے

——— اللہ اکبر کے خار شگاف نعروں سے سوتی قوم کو جگا دیا جاتا۔ روپیہ کی بوچھار ہوتی اور بچہ دوسری پارٹی کی طرف منتقل ہو جاتا۔ لیکن فوراً ہی تلک دھاری پنڈت اور قوم کے موٹے موٹے لیڈر آکاش کے کل دیوتاؤں کو تڑپ تڑپ کر پکارتے اور بچہ پولو کی گیند کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر لڑھکا دیا جاتا۔ انسانی زندگی کا یہ کھیل انتہائی دلچسپی پر پہنچ گیا۔

معاملہ اور بھی نازک ہو گیا۔ برجو نے صاف انکار کر دیا کہ ثبوت ملنے سے پہلے وہ کسی طرح بچے کو جدا نہ کرے گی۔ اس کے ماں باپ انتہا سے زیادہ پریشان تھے! انھوں نے بہت سمجھایا کہ جو لینے میں ٹرائے بچے کو، اس سے دست بردار ہو جائے۔ مگر وہ ایک ضدی بچی کی طرح اڑ گئی۔ بچے کی محبت، عوام کی زیادتی کہ وہ اس کے پیچھے فضول لڑ رہے تھے اور اوپر سے اس کی ضدی طبیعت، ان تینوں چیزوں نے مل جل کر اسے دیوانہ بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ رشید کے سمجھانے پر اور بگڑ گئی۔

اسے پروا نہ تھی کہ فیصلہ ہندوؤں کے موافق ہو یا مسلمان کے، وہ تو صرف بچے کو چاہتی تھی۔

اور آخر اس کے صبر کی انتہا ہو گئی۔ جب بچے کو ایک پارٹی کے حق میں مکمل فیصلہ ہو جانے کی وجہ سے اس سے درخواست کی گئی کہ وہ بچے کو فوراً دے دے۔

"کبھی نہیں یہ میرا بچہ ہے"۔ اس نے بادلوں کی طرح چیخ کر کہا۔

"تمھارا بچہ ؟" وکیل نے دھوکا کھا کر جرح کی۔

"میں نہیں دوں گی"۔ وہ کچھ مجبور ہو کر اور بھی دیوانی ہو گئی۔

"تمھیں ثبوت دینا ہو گا کہ یہ تمھارا بچہ ہے"۔

"برجو نے پریشان ہو کر سر جھکا لیا۔ واقعہ ایک نئی صورت میں تبدیل ہونے لگا۔

"کیا کوئی ماں یہ ثبوت دے سکتی ہے کہ اس کا بچہ اسی کا بچہ ہے"۔

دوسرے وکیل نے کہا۔ "ثبوت یہی ہے کہ وہ اس کی ماں ہے اور وہ اس کا بچہ"۔
کچہری میں غلغلہ مچ گیا۔ برادری کی لاج اور بدنامی کا خاکہ اڑنے لگا۔ لالہ جی نے چاہا
وہ اسے زبردستی گھر لے جائیں۔ مگر برجو پر ضد بری طرح سوار تھی۔
"نہیں میں اسے نہیں دوں گی"۔ اس نے بچے کو چمٹا کر کہا۔
"آپ دیکھتے نہیں کہ بچے کے جدا کرنے کے خیال سے ہی لڑکی کی حالت غیر ہو جاتی
ہے۔ اور پھر بھی آپ ثبوت مانگتے ہیں۔ دیکھئے ذرا دیکھئے۔ کیا اب بھی آپ کو کوئی شک ہے؟"
وکیل نے کہا۔ اور ماتا کا ایک دل دوز سین دیکھ کر سب کے سر معنی خیز طور پر ہلنے لگے۔ کئی
آنکھوں میں تو آنسو آگئے۔
"مگر تمھیں ثبوت دینا ہوگا! اس کا باپ کون ہے"۔ جج کی بھاری آواز گونجی۔
"باپ ؟"۔ برجو نے گھبرا کر کہا۔
"ہاں تمھیں بچے کے باپ کا نام بتانا ہوگا"۔
"میں نہیں جانتی"۔ برجو نے ہارتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں اور سر
جھک گیا۔
"ظلم ہے، یہ صریحاً ظلم ہے، آپ ایک لڑکی سے اس کے ناجائز بچے کے باپ کا نام
پوچھتے ہیں"۔ بکواسی وکیل بولا۔
"یہ جھوٹ ہے"۔ لالہ جی تڑپ کر بولے۔
"ہر باپ کو بیٹی کے ایسے معاملے کو جھوٹ کہنے کا حق ہے"۔ وکیل بڑبڑایا۔
معاملے کی عجیب و غریب ہیئت کو دیکھ کر برجو بد حواس ہو گئی۔
"یہ میرا بچہ نہیں ہے"۔ اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔
"ہا ــــ سچ سچ ــــ غریب لڑکی ــــ عزت کے آگے ماتا پگھلی جا رہی ہے"۔
وکیل نے تاسف اور درد بھرے لہجہ میں کہا۔

برجو نے بچے کو علیحدہ کرنا چاہا۔ لیکن وہ اس سے چمٹ گیا۔ برجو اور بھی پریشان ہوئی۔ وکیل کی ہمت بڑھی۔

"بیسویں صدی میں ایسی بھی مائیں ہوتی ہیں۔ کیا تم اس بچے کو یتیم خانہ میں چھوڑ دوگی۔ تاکہ وہ قوم کے ناکارہ فرد کی طرح بڑا ہو ـــــ کیا تمہارا دل اس ناانصافی کو قبول کرے گا۔" وکیل بے بات برجو سے الجھ پڑا۔ اور یتیم خانوں کی دردناک حالت کا ذکر کر کے اس نے اسے دہلا دیا۔ اس نے بچے کو پیار سے اپنے قریب کر لیا۔

"میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔" اس نے خود سے کہا۔

"کوئی ثبوت، کوئی اور ثبوت؟ یہ بچہ تمہارا ہے۔ بشرطیکہ تم اس کے باپ کا نام بتاؤ۔" برجو کے خاندان والوں کی چیخ پکار کے درمیان جج نے فیصلہ کیا۔

برجو کا سر جھک گیا۔ اور جب اس کی شکست خوردہ آنکھیں دوبارہ اٹھیں تو رشید کے چہرے پر پڑیں۔ جو پہلے ہی سے پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ خاموشی سے لوگوں میں اشارے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا گیا اور معاملہ صاف نظر آیا۔

رشید بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ برجو نے بچے کو چھوڑ دیا اور وہ رینگتا ہوا رشید کے پاس جا پہنچا۔ محبت کا یہ دردناک سین دیکھ کر لوگوں کو بے اختیار آنسو چھپانا پڑے۔

اور پھر غیب سے فرشتوں نے دیکھا کہ دو ہاتھ ایک رجسٹر پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ہاتھ برجو کا تھا اور دوسرا رشید کا۔

اب بھی ان دونوں میں بچے کی وجہ سے ویسی ہی دلچسپ لڑائیاں ہوتی ہیں۔

"میرا بچہ!" ایک کہتا ہے۔

"میرا بچہ!" دوسرا ضد کرتا ہے۔

"ہم دونوں کا بچہ!" دونوں اتفاق رائے سے فیصلہ کرتے ہیں

تِل

"چودھری — اے چودھری — سنو —"
گنیش چندر چودھری چپ تھا۔
"شش —"
"۔۔۔۔ کیا جھینگر کی طرح شی شی کرے جا رہے ہو۔ بھئی میں تھک گئی جو —"
"چپکی بیٹھے گی کہ —"
"مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا — واہ — ساری پیٹھ تختہ ہو گئی — ہائے رام — ہنک — ہنک —"
"چچ چچ —"
"مجھے سردی لگ رہی ہے —"
چودھری چپ۔
"یہاں — یہاں نیچے کولھوں میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں"۔
"دیکھو رانی دس منٹ بھی نہیں ہوئے اور تو تھک گئی"۔
"اور کیا — کوئی میں مٹی کی بنی ہوں، واہ —" رانی نے اپنے موٹے ہونٹ

پھیلائے اور مصنوعی سنگ مرمر کی چوکی سے نیچے پھسل گئی۔

"چڑیل —— کہتا ہوں سیدھی بیٹھ —— حرامزادی ——" چودھری نے رنگوں کی تھالی اسٹول پر پٹخی اور رانی کے کندھے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیئے۔

"تو —— تو —— تو پھر لو ——" وہ زمین پر لمبی لمبی لیٹ گئی۔ چودھری جل کر کوئلہ ہو گیا —— اس کا جی چاہا رانی کے چکنے چکنے سیاہ گالوں پر کھڑی کھڑی تھپیاں مارے۔ مگر وہ جانتا تھا پھر تو وہ بالکل ہی قابو سے باہر ہو جائے گی اور بہانہ کر کے رونے چیخنے لگے گی اور پھر وہ تصویر جس کے لئے وہ اتنی جان ماری کر رہا تھا نامکمل رہ جائے گی۔

"دیکھو تھوڑی دیر اور بیٹھ رہ —— اور پھر ——" چودھری نرمی سے بولا۔

"تھک گئی نا ——" وہ لوٹ کر چت ہو گئی۔

"تھک گئی! —— اور جو سڑک پر دن بھر گوبر بینتی تھی تو نہیں تھکتی تھی۔ کتیا کہیں کی" چودھری کو پھر غصہ چڑھا۔

"کون بینتا تھا گوبر —— تم بینتے ہو گے —— واہ کیسے ساس نندوں کے سے طعنے دیتے ہو ——" وہ روٹھ کر بیٹھ گئی اور چودھری کو یقین ہو گیا کہ آج کا دن تو گیا ہاتھ سے۔

"اچھا دیکھ گھڑی رکھی ہے یہ —— بس آدھ گھنٹہ —— سمجھی ——"

"آدھ گھنٹہ نہیں —— بس چھ منٹ ——" وہ چوکی پر چڑھتی ہوئی بولی۔ بات یہ تھی چھ سات سے زیادہ تو اسے گنتی بھی نہ آتی تھی۔ اور چودھری خوب جانتا تھا کہ چھ منٹ کے بہانے وہ اسے آدھ گھنٹے تک جانے رکھے گا۔ رانی نے کمر کو کھینچ کر لمبا کیا اور بھاری پھول دار مٹکی جھٹکے سے کاندھے پر رکھی اور بیٹھ گئی۔ مگر کتنی دیر کے لئے۔

"ٹھیک ہے نا ——"

"ہاں ——" چودھری جلدی سے جھک گیا۔

"دیکھو تو ——"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے ___

"دیکھو تو ___"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے ___"

تھوڑی دیر خاموشی سے برش چلتے رہے۔ رنگ پر رنگ دوڑتے رہے۔ مگر کوئی ڈیڑھ منٹ بھی نہ گذرا تھا کہ رانی نے لمبی سی سانس لی۔

"آہا ___ بس چودھری ___ ہو گئے چھ منٹ ___"

"ہوں ہنگ ___" وہ جلدی جلدی کبھی اسے اور کبھی ادھ بنی دھبوں والی تصویر کو دیکھنے لگا۔

"سردی لگ رہی ہے چدّر اوڑھ لوں۔ ___"

"نہیں ___"

"آ ___ آ ___ ئے ___ جاڑا ___" وہ کتوں کی طرح رونے لگی۔

چودھری۔ "چپ ___"

"کمر ___ کمر ___ میری کمر ___ ___ چودھری جی ___" اصل وہ آج شرارت پر تلی ہوئی تھی۔

"چدّر ___ چدّر ___ میری چدر ___"

چودھری۔ چپ

"ہوں ___ کہہ رہی ہوں میں تھک گئی۔ اب یہ ہنڈیا پٹختی ہوں ہاں نہیں تو ___ چودھری جلدی سے مڑا۔ وہ یہ تصویر مکمل کرنے کے لئے ہنڈیا عجائب خانے سے مانگ کر لایا تھا۔ اگر رانی توڑ دے تو بس سمجھ لو کہ رانی کی کھوپڑی کی خیر نہیں۔

"تو پھر تھک جو گئی ___ جوں کاٹ رہی ہے چودھری ___ وہ اپنے گھنے ہوئے بالوں کو الجھانے لگی۔ اور پھولدار مٹکی نیچے ٹکا دی۔

چودھری نے پیر دور دور رکھ لیے۔ آنکھیں گھما کر لٹو کی طرح باہر نکال لیں اور غصے سے اس کے چہرے کا گوشت پھڑکنے لگا۔ اس کی چتکبری چھدری داڑھی کشتی کے بادبان کی طرح لہرانے لگی۔ جیسے بڑا بھاری طوفان آنے پر سفید بادبان ہلتے ہیں اور اس کی گنجی چکنی کھوپڑی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئیں۔

"لیکے کمر تو دکھ گئی ــــ" رانی نے ڈر کر جلدی سے اپنی نشست ٹھیک کر لی اور پھر وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"او ہو ــــ ہو ــــ ہو برررر ــــ" وہ ہونٹ بجا کر ڈکرائی۔

"د ــــ در ــــ در ــــ کوئی مر بھی جائے تو بھی ــــ رر ــــ رو ــــ بررر۔"

چودھری نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورا ــــ جب کبھی بھی وہ رونے لگتی تھی تو چودھری کے رخساروں کی مچھلیاں پھدکنے لگتیں اور ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہونے لگتا اور برش ہاتھوں پھلجھڑی کی طرح ناچنے لگتے۔ طشتری کے سارے رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ایک خلا میں تبدیل ہو جاتے اور اسے کچھ نہ سوجھتا اور یہ کرب کی حالت اس پر جب تک طاری رہتی جب تک اس کے دماغ میں سے چبھتا ہوا کانٹا نہ نکل جاتا اور رانی کی حرکتیں اس وقت کانٹے نہیں بھالے بن کر اس کی ہستی کے آرپار نکلی جا رہی تھیں۔

ہر ذی روح پر چودھری کے اس دورے کا پورا پورا اثر تھا۔ چنانچہ رانی نہ بچ سکی۔ اس نے پھر اپنے پیٹ کو اندر پچکایا اور ہونٹوں سے پھرکنی سی آواز نکالتی ہوئی سیدھی ہو بیٹھی۔

تھوڑی دیر تک دنیا پھر اپنے محور پر گھومتی رہی۔ چودھری کا برش سپاٹے بھرتا رہا۔ رنگ کی تھالی گندی اور بدشکل ہوتی گئی۔ لیکن ــــ

"چودھری"۔ اس دفعہ رانی پیار سے بولی۔ چودھری کی بغل میں جیسے چوہا سا کودا۔ دنیا کے محور کا ایک پایہ ذرا لچکا ـــــ جانے بھائی محور میں پائے لگے ہوتے ہیں۔ نہیں ـــــ لیکن ہوا کچھ نہ کچھ ضرور!

"چودھری تم نے یہ دیکھا ہے ـــــ"

چودھری کے کندھے جھرجھرائے۔ اور چکنی ڈلی کی شکل کی کھوپڑی میں پسینے کے دانے پھوٹ نکلے۔ وہ پھر بولی۔

"یہ دیکھو ـــــ یہ کالا تل! ـــــ یہ دیکھو گردن سے ذرا نیچے ـــــ اور نیچے ـــــ ذرا الٹی طرف ـــــ" ایک ہاتھ سے پھول دار منگی پکڑ کر اور ہونٹ لٹکا کر اپنی گردن نے نیچے جھانکنے لگی۔

"دیکھا ہے یہ ـــــ تل ـــــ اور ـــــ تم تو دیکھ رہے ہو چودھری"۔ وہ بن کر شرمانے لگی۔ "واہ مجھے شرم آتی ہے"۔

"سیدھی بیٹھ ـــــ" چودھری غرایا۔

"اوں ـــــ بڑے آئے ـــــ بھلا کوئی کسی کا تل بھی دیکھتا ہوگا۔ اور جب وہ ایسی بری جگہ ہو ـــــ ہی ـــــ ہی ـــــ ہی ـــــ" وہ اترائی ـــــ "بری جگہ ہے ـــــ تل ـــــ تم نے دیکھ تو لیا۔ بولو ـــــ"

"میں نے تل دل نہیں دیکھا اور نہ دیکھوں ـــــ" بدمزاجی بڑھی۔

"ہوں ـــــ جھوٹے ـــــ سراسر۔ کانڑی آنکھ کر کے دیکھ رہے ہیں اور ـــــ ہی ـــــ ہی ـــــ" وہ آوارہ عورتوں کی طرح اٹھلائی۔

"رانی!"

رانی نے صرف ناک اچکا دی۔

چودھری مغلوب ہو کر کاٹھ کے خالی ڈبے پر بیٹھ گیا۔

"تجھے معلوم ہے کہ میں کتنا بڑا ہوں ___"

"ہائے رام ___ کوئی ۔۔۔۔ کتنے بڑے ہو؟" وہ بھی ٹکٹکی لگا کر آگے جھک گئی۔

"میں تیرے باپ بلکہ دادا برابر ہوں ___ اور تو ___ تو بتا تو کتنی ہوگی؟

پندرہ برس سے آگے نہیں اور تجھے یہ بدمعاشی کی باتیں کس نے سکھائیں ہیں؟"

چودھری دادا برابر تو کیا اس کے باپ برابر بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ذرا معاملہ کو دبانے کے لیے کہہ دیا تھا اس نے۔

"اوں ___ بدمعاشی کی باتیں تم کرتے ہو کہ تل دیکھتے ہو ___ ایسی بری جگہ تو تل ہے ___" وہ آہستہ آہستہ تل ٹٹولنے لگی۔

"ذرا سی چھوکری ___"

"ذرا سی چھوکری ___ ذرا سی کاہے کو ہوں واہ ___ ذرا سی کہتے رہتے ہو ___ ذرا سی ہوتی ہو ___"

"تو پھر ___ تو ___ تو کیا ہے؟"

"رتنا کہتا ہے۔ جس کی چھاتی پر یہ تل ہوتا ہے نہ ___ وہ ___"

"رتنا ہے؟ ___ یہ رتنا کو کیا معلوم تیرے کہاں کہاں تل ہیں ___"

"میں نے دکھایا تھا ___" وہ تل کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔

"تو نے ___ تو ___ تو ___ تو نے رتنا کو دکھایا تھا تل ___"

چودھری کا پھر خون کھلبلایا اور بغلوں میں چوہے پھدکے اور گالوں کا گوشت ہلا ___ پھر برش پھلجھڑی کی طرح تھر کنے لگے اور رنگ ملنے شروع ہوئے۔

"آ ___ تو ___ واہ ___ اس نے دیکھ لیا تو میں کیا کرتی ___"

"کیسے، کیسے دیکھ لیا ___ تل اس نے جبکہ تو ___" چودھری کی بتیسی ڈھیلے کواڑوں کی طرح بجنے لگی۔

"نہا رہی تھی میں تو اس نے ـــــ" اس نے سلکی سنبھالی اور نشست پر سجنے لگی۔

"تو نہا رہی تھی ـــــ اور ـــــ وہ آگیا ـــــ حرامی پلا ـــــ"

"ہاں تلیا پر نہا رہی تھی ـــــ مجھے اکیلے ڈر لگا کہ کوئی آنہ جائے۔ اس لئے میں اسے سنگ لے گئی ـــــ کوئی آجاتا تو ـــــ میں نہا رہی تھی ـــــ شلوکہ بھی دھویا ـــــ"

"تجھے ڈر لگا کہ کوئی آنہ جائے۔ اس لئے تو اسے لے گئی ـــــ"

"ہاں ـــــ" اس نے بھول پن سے فیصلہ کیا۔

"رانی ـــــ" وہ آگے بڑھا ـــــ

"آں ـــــ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ادھر منہ رکھیو ـــــ مگر ـــــ"

"مگر ـــــ ؟"

"مگر وہ دور بیٹھا رہا ـــــ پھر میں نے کہا رتنا میرے تل ہے، بڑی بری جگہ ـــــ وہ بولا نہیں تو۔ میں نے کہا تو نہیں دیکھتا تو مت دیکھے ـــــ ہاں بھئی مجھے کیا؟ ـــــ کیوں چودھری ـــــ"

"پھر تو کیسے کہتی ہے اس نے تل دیکھا ہے؟"

"ہاں پھر میں ڈوبنے جو لگی۔ پانی اِتّا اِتّا گہرا تھا" وہ تل سے ذرا نیچے انگلیاں رکھ کر بولی۔

"قطامہ!" چودھری برش پھینک کر لکھڑی کی طرف چلا

"ہائے رے رام ـــــ پھر ـــــ پھر سن تو ـــــ چودھری ـــــ تو کیا میں ڈوب جاتی ؟"

"تجھے تیرنا نہیں آتا ـــــ کتیا! رات دن ہودی میں جو ڈبکیاں لگاتی تھی

تب نہ ڈوب مری ـــــ"

"واہ ـــــ واہ میں کیوں ڈوبتی ـــــ میں ـــــ میں ـــــ تو تل دکھا رہی تھی ـــــ"

"تو نے تل دکھانے کے لئے بہانہ کیا تھا ـــــ؟" چودھری نے پتلی سی نیمچی ہوا میں نچائی۔ وہ اب مسکرا رہا تھا۔

"ہائے رام ـــــ مجھے ـــــ دھوتی تو اوڑھ لینے دو ـــــ چودھری جی"۔ وہ بندریا کی طرح اچک کر کھاٹ کے اوپر جا کھڑی ہوئی۔

"جو تم مارو گے تو سڑک پر بھاگ جاؤں گی چودھری، پھر مجھے شرم آئے گی ـــــ میں کہہ دوں گی چودھری ـــــ چودھری ـــــ"

بڈھا رک گیا "کیا کہہ دے گی ـــــ"

"میں کہہ دوں گی چودھری کہتا ہے کہ ـــــ میرا تل ـــــ ام ـــــ ام ـــــ"

"لچّی!" چودھری پاگل گیدڑ کی طرح ناچ اٹھا۔ رانی سمجھ گئی کہ تیر نشانہ پر بیٹھا۔

"سب سے کہہ دوں گی ـــــ سنا چودھری؟ مارو تم مجھے ـــــ مار کے کبھی دیکھ لو ـــــ واہ ایسے کیوں گھور رہے ہو ـــــ اتنی تو چھوٹی ہوں میں ذرا سی چھوکری ـــــ بڑے خراب ہو تم جی ـــــ" وہ ہلکے ہلکے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

چودھری سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا کہ اٹھ کر تصویر میں تو لگا دے آگ اور رانی کو اتنا کوٹے کہ کچومر بنا دے مگر پھر اسے نمائش یاد آگئی جس میں اسے پانچ ہزار کا انعام ملنے والا تھا۔

ایک تو اس کا سر ویسے ہی گھوم رہا تھا۔ وہ تصویریں تو بنانے لگا تھا اور ہزاروں ہی تصویریں بنا کر چھوڑ دیں۔ اس نے کھلتے ہوئے گلاب کا شرمایا ہوا رنگ، ٹھٹھا مارتا

ہوا سبزہ، ناچتا تھرکتا آبشار بھی بنایا تھا۔ اس نے سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر رکھ دیا تھا۔ دور دور کے ملکوں کی ننگی اور آراستہ پیراستہ عورتیں بھی اس کے سامنے گھٹنوں بیٹھنے کا فخر حاصل کر چکی تھیں۔ مگر یہ چلبلی گنوار چھوکری جسے اس نے موری کی غلاظت سے اٹھا کر اپنے آئندہ شاہکار کے لئے چنا تھا، اس کے قابوں میں نہ آئی۔
سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ہزاروں رنگ لتھیڑنے پر بھی وہ اس کے جسم جیسا مسالہ نہ تیار کر سکا۔ اس نے سیاہی میں صندل گھول کر اس میں ذرا سا نیلا رنگ ملا دیا۔ پھر بھی اس کے رنگ آبنوسی، صندلی، نیلی اور کچھ بادامی لہر لئے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر تھی۔ آج اس کا رنگ سرمئی ہوتا تو دوسرے دن اس میں شفق کی سی سرخی پھوٹنے لگتی ——— اور پھر کبھی بالکل اچانک اس کا جسم ختم ہوتی ہوئی رات کی طرح کچھ اودی اودی گھٹاؤں سے ملنے لگتا۔ اور کبھی نہ جانے کہاں سے اس میں سانپ کے زہر کی سی نیلاہٹ جھلکنے لگتی۔

اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں۔ اس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے کولتار کا سا سیاہ رنگ گھول کر تیار کر لیا ——— لیکن پھر اسے پتلی کے گرد لال لال ڈورے نظر آئے ——— خیر وہ بھی ہوا، پھر ان ڈوروں کے آس پاس کی زمین بادلوں کی طرح نیلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جھنجلا گیا اور ڈھیر سا رنگ بیکار گیا۔ لیکن اس کے غصے کی جب تو انتہا ہی نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں وہ کولتار جیسی پتلیاں سبز ہونے لگیں۔ اور ہوتے ہوتے دو زمرد کی ڈلیوں کی طرح ناچنے لگیں۔ پتلیوں کے آس پاس کا میدان دودھیا سفید ہو گیا۔ اور ڈورے، قرمزی ہو گئے ——— اف! وہ سر پکڑ کر جھومنے لگا ——— اور اوپر سے یہ باتیں۔

"مچھر کاٹ گیا ———" وہ بچوں کی طرح منمنائی۔

آج چودھری نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ گھنی سادھ جائے گا اور بولے گا ہی نہیں۔

"اتنے مجھے کاٹتے ہیں کہ کیا بتاؤں ـــــ یہ مچھر ـــــ"

چودھری چپ!

"ہائے رے کیسے کاٹتے ہیں ـــــ یہ مچھر ـــــ" اس نے موٹی سی ایسی بازاری گالی بکی جو کچھ عام بھی نہیں۔

چودھری اچھل پڑا! گالی۔ یعنی یہ لڑکی ہو کر اتنی موٹی گالی جانتی ہے! وہ خود سوائے چند بالکل زبان زد گالیوں کے ایک بھی گہری قسم کی گالی نہ جانتا تھا۔ اس نے کبھی گالیوں کے مسلئے پر غور ہی نہیں کیا اور یہ گالی تو شاید دارو غہ جی کو بھی نہ آتی ہو گی۔ وہ بھی صرف چند مخصوص الفاظ استعارے کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں۔ محض ضرورتاً!

"یہ تو نے گالیاں کہاں سیکھیں؟" وہ مڑ گیا۔

"کون سی ـــــ یہ ـــــ" اس نے پھر بھول پن سے گالی دہرائی۔

"رانی!" وہ بھبکا!

"چنن نے دی تھی ایک دفعہ مچھروں کو ـــــ اس کی کھولی میں بھی بہت مچھر ہیں ـــــ" وہ بات ٹالنے لگی۔

"اس کی کھولی؟ ـــــ تو اس کی کھولی میں بھی گئی تھی"۔

"ہاں وہ لے گیا تھا کہ چل گڑ دھانی کھائے گی"۔

"پھر گڑ دھانی کھائی تو نے؟"

"کہاں؟ گڑ دھانی تھی بھی نہیں، جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر اب لا دیتا ہے"۔

"تجھے چنن گڑ دھانی لا دیتا ہے ـــــ"

"ہاں اور کھیلیں"۔ وہ مٹکی پر نقش و نگار ٹٹولنے لگی۔

"اور کھیلیں ـــــ!" چودھری جانتا تھا کہ وہ بے کار حیرت زدہ ہو رہا ہے، رانی گڑ دھانی پر فریفتہ تھی۔ وہ چنن کی کھولی چھوڑ موری میں کتے کے جبڑوں میں سے

گڑدھانی نکال کر کھا سکتی تھی۔

"میں نے تجھے پیسے دیئے پھر بھی تو چنن کی گڑدھانی لیتی ہے۔"

"اوں۔ میں کب لیتی ہوں۔ میں کوئی منگتی ہوں۔ وہی دیتا ہے۔ کہتا ہے چل کھولی میں —— مجھے تو وہ آپ برا لگتا ہے۔ ایسی بڑی بڑی مونچھیں ہیں —— مجھے تو چھینکیں آنی لگتی ہیں۔ خوں —— خوں ——" وہ ناک سکیڑ کر پھڑ پھڑانے لگی جیسے کسی نے اس کی ناک میں بتی کر دی ہو۔

"ذرا بیٹھ کھجا لوں —— چودھری ——" پھر چودھری پر وہ دورانی کیفیتیں چھانے لگیں۔ بھیجے میں تالیاں سی بجنے لگیں اور گال اوپر نیچے کودنے لگے۔ پانچ ہزار روپے کھنن کھنن اس سے دور ننھے ننھے تاروں کی طرح ناچ ناچ کر بھاگنے لگے۔ بھورا، کالا، سرمئی، اور پیلا سب رنگ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے لگے اور کھوپڑی پر آبلے سے ابھر آئے۔

○

اب سوال یہ تھا تصویر بنائے یا پاگل ہو جائے۔ اگر یہی چال رہی تو وہ دن دور نہ تھا جب وہ سچ مچ کپڑے پھاڑ کر سڑک پر باؤلے کتے کی طرح لوٹ لوٹ کر اپنا سوکھا مارا جسم چھیل ڈالے اور اپنے دہکتے ہوئے سر کو تلیا کے پانی میں ڈبو دے۔

یونہی اس کے قدم تلیا کی طرف اٹھ گئے۔ تلیا دور نہ تھی۔ عموماً وہ وہاں گھنٹوں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کو سطح آب پر تھرکتے ناچتے دیکھنے چلا جایا کرتا تھا۔ اور وہ شاعر تھا —— پیدائشی شاعر، وہ دنیا میں تو رہتا تھا، مگر دنیا سے کتنا دور، بڈھا تو وہ نہ تھا —— مگر جوان بھی اسے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ اس نے ڈاڑھی لاپروائی کی وجہ سے چھوڑ رکھی تھی۔ اور وہ کچھ یوں ہی سی چتکبری ہو چلی تھی۔

"اوہ!" پھر اس کی بغلوں میں کوئی چیز پھڑ پھڑائی —— رانی کے ہنسنے

کی آواز ایک بھرائی ہوئی مینڈک کی آواز کے ساتھ آئی۔ مینڈک ہی ہوگا۔ اور کیا۔ برسات ـــــ خیر برسات تو دور تھی ـــــ مگر نہیں مینڈک نہیں بلّی خرخراتی ہوگی

بلی تو کیا ہاں کچھ ہوگا ضرور!

لیکن جب اس کی پارسا آنکھوں نے رانی کو رتنا کے سنگ پانی میں چہلیں کرتے دیکھا تو تھوڑی دیر کے لئے وہ اسے بھی اپنے تخیل کا فریب سمجھا۔ تخیل اسے چھیڑنے کے لئے نئے نئے بہانے تراشا کرتا تھا۔ اور آج تو حد کر دی۔

لیکن جب وہ آگے بڑھا تو ہنسی کے زمزمے رک گئے اور وہ حیرت زدہ سنگ موسیٰ کے سے جیسے آنکھیں پھاڑنے لگے۔ کس قدر صاف تھا واہمہ بالکل بال بال صاف، رتنا کے پٹھوں کا ابھار، پانی سے بھیگی ہوئی اس کی لمبی چوٹی ـــــ قریب قریب بیٹھی ہوئی دو آنکھیں ـــــ اور رانی کی الجھی ہوئی چوٹی ـــــ وہ سرمئی، عنابی، صندلی، کافوری اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بنا ہوا جسم اور تل! ـــــ وہ تل! ابھرا ہوا ـــــ گولی کی طرح چودھری کے سینے میں آکر کھٹ سے لگا ـــــ ایک طرف کو سرکتا، بچتا رتنا تو نکل گیا۔ اور بھاگا دھوتی اٹھا کر اور رانی دلیری سے کھڑی چھپ چھپ کرتی رہی۔ چودھری کو معلوم ہوا کوئی اسے جھولے میں ڈال کر لمبی لمبی پینگیں دے رہا ہو۔

"تل دیکھ رہے ہو میرا ـــــ بڑے برے ہو جی ـــــ" وہ منانے کے لئے اٹھلانے لگی۔ چودھری شکر ہے کہ کھڈ کے کنارے آکر سنبھلا۔

"باہر نکل ـــــ!" اس نے اس نئے چودھری کو پرے دھکیل کر کہا جو دھیمے دھیمے ڈوبتا جا رہا تھا۔

"اوں۔ تم مارو گے ـــــ" وہ پانی میں سے اوپر ابھر آئی۔

"آج تجھے ادھیڑ کر نہ ڈال دیا ہو تو میرا نام چودھری نہیں ـــــ" چودھری

نے خود کو یقین دلایا کہ یہ وہی تو چھوکری تھی جو کیچڑ میں مینڈکی کی طرح پل رہی تھی۔

"عورت پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آئے گی؟" چودھری سلگ گیا۔

"ننگی عورتوں کو پیٹتے ہو؟ ــــ واہ ــــ" وہ اور اوپر ابھری۔

"شرم نہیں آتی ــــ" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ اور پانی اس کے ٹخنوں تک آ رہا تھا۔ اور وہ ڈر رہی تھی۔ اسی لئے ذرا اکڑ کر باتیں کر رہی تھی۔

"اوں ــــ جاؤ ــــ" وہ شرمانے لگی۔

چودھری کے ہاتھ سے وہ لچکتی ہوئی پچی گر گئی۔ اور اس کا قد کئی انچ لمبا ہو گیا۔ اس کے بازو پھول گئے اور بھیجے میں سرسریاں سی رینگنے لگیں۔ ببول کے انبار کو ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوئی سیاہ آندھی بہا لے گئی اور چنگاری بھڑکی ــــ دھڑ دھڑ دھڑ ــــ شعلے لپکنے لگے ــــ اس کی آنکھیں بھوکی چیلوں کی طرح سیاہ ابھرے ہوئے تل پر جھپٹیں اور ــــ اوہ گھن سے جیسے وہ تل ایک سیاہ چٹان بن کر اس کے ماتھے سے ٹکرایا، ایک دم وہ لوٹ پڑا اور پٹے ہوئے کتے کی طرح بھاگا۔ کدھر، اپنے کمرے میں پلنگ کی طرف، اسی دن اس نے رتنا کو نکال دیا ــــ وہ بہتیرا کہتا رہا کہ وہ لنگوٹ پہنے تھا۔ مگر چودھری پر تو بھتنا سوار تھا۔ وہ ساری رات خیالات کی فوج کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ کوئی چیز اس کے جسم میں برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھی ــــ مگر سوراخ ہو ہی نہ چکتا تھا ــــ جیسے کوئی چٹان راستے میں آ گئی ہو۔

آج اسے اپنی تصویروں میں لگانے کو رنگ مل رہے تھے! کتھئی میں ذرا سی نیلاہٹ ملا دینے سے بالکل وہی ــــ وہی بھیگا ہوا سمندر کی تہ جیسا گہرا اور جیتا جیتا رنگ بن گیا ــــ اور آنکھوں کے لئے بھی بس سیاہی میں ہلکی سی سنہری ــــ نہیں اوداہٹ یا شاید سرمئی رنگ اور پھر گلابی گوٹ ــــ جہاں آنکھیں ختم ہوتی ہیں نا۔ اس نے چاہا آئینے میں اپنی صورت دیکھے ــــ لیکن آئینہ تو جانے

اس نے کب سے نہیں دیکھا تھا ـــــ ایک مصور کو آئینہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں آئینے میں دیکھنے کے لئے ہوتا ہی کیا ہے؟ اس کا آئینہ تو وہ ساری تصویریں تھیں جن میں چہرہ تو چہرہ اس کی روح کا کونا کونا نظر آتا تھا۔ اس کا دل اور دماغ سب ہی کچھ تو رنگوں میں سمویا ہوا سامنے موجود تھا۔

پھر بھی اس نے چاہا کہیں اپنی صورت دیکھے! اس نے ایک ٹین کے ڈبے کو جس میں اس کے رنگ دور دور کے شہروں سے آیا کرتے تھے۔ الٹ کر جھاڑا ـــــ دو جھینگر پھدک کر اس کی ناک پر ٹپا کھاتے اڑ گئے ـــــ مکڑی کا جالا اس نے کہنی سے جھاڑ کر اس میں اپنا منہ دیکھا ـــــ

پہلے تو اسے کچھ نظر نہ آیا ـــــ جیسے سمندر کی تہ میں باریک باریک جھاڑ اور پھندنے سے ہوتے ہیں ـــــ یا جیسے آنکھوں میں پلکیں گھس جاتی ہیں تو پھیلا پھیلا دکھائی دیتا ہے ویسا دکھائی دیا ـــــ پھر ایک بھیانک ڈاڑھی اور پیاسی پیاسی آنکھیں دکھائی دیں ـــــ اور یہ وہ خود تھا! وہ؟ وہ ـــــ جو ـــــ مگر ایسا تو کبھی تھا ہی نہیں ـــــ ایسا؟ اس نے ٹین کا ڈبہ اوندھا دیا اور بغیر آئینے کے اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے داڑھی تو خیر نظر آئی اور ایک آنکھ بند کرنے سے تھوڑی سی کالے دھبے والی ناک اور پھولی ہوئی مونچھ دکھائی دی ـــــ مونچھ! ـــــ اگر قینچی ہوتی تو وہ ـــــ ذرا ـــــ ذرا سا مونچھ کو ویسا کر دیتا ـــــ رانی کہتی تھی چینن کی مونچھوں سے چھینکیں آنے لگتی ہیں ـــــ فوں ـــــ فوں ـــــ وہ خود بھی ناک بجانے لگا۔ یہ تو خیر معلوم تھا کہ رتنا لنگوٹ پہنے تھا۔ کیا عجب دھوتی بھی ہو ـــــ پہنے ہو ـــــ یا پہننے والا ہی ہو کہ وہ آ گیا ـــــ مگر یہ چینن ادھر اس کی گرد دھانی!۔

اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کمرے کی دیواریں گرد دھانی کی بنی ہوئی ہیں اور وہ اسے کھینچے ڈال رہی ہیں ـــــ وہ ایک پسی ہوئی مکھی کی طرح گرد دھانی کے ایک

بڑے سے ڈھیر پر چپکا ہوا ہل رہا ہے۔ جب وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا اور ٹانگیں شل ہو گئیں تو وہ اسٹول پر ٹنک گیا ــــ پردہ ہٹا کر اس نے اپنی ادھوری محنت کو دیکھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے داغ دھبے گھومنے لگے اور ایک دم ٹھہر گئے ــــ ثنا نے پالش کئے ہوئے چمڑے کی طرح چمکنے لگے اور آنکھوں میں نیلی، ہری، کالی روشنیاں گھومنے لگیں ــــ اور تل! یہ تل کہاں سے آیا۔ سانپ کی طرح کنڈلی مارے ابھرا ہوا تل! ٹک ٹک۔ ٹک ٹک۔ گھڑی کی طرح اس کا دل ہلنے لگا۔

وہ ایک دم اٹھا اور اس کے پیر رانی کی کوٹھری کی طرف اٹھ گئے۔ گندی سیلی چھوٹے سے دروازے کی گھٹی ہوئی کوٹھری! وہ کل ہی اسے اونچا کرائے گا ــــ نہیں۔ اونچا نہیں ــــ وہ جو دوسرا کمرہ ہے۔ جس میں خالی ڈبے پڑے ہیں، وہ ٹھیک ہے ــــ وہ اندھیرے میں بڑھنے لگا ــــ اس کا دل اب بھی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کوٹھری کی سیاہی کھلی ہوئی کالو نچ کی طرح اس کے چاروں طرف لپٹ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ چارپائی سے ٹکرائے اور ــــ پھر بان کے جھولے میں دھنس گئے ــــ اس نے جلدی جلدی سارا پلنگ ٹٹول ڈالا۔ مگر رانی نہ تھی۔

سارے بدن پر جیسے مچھروں نے لپٹ کر چٹکنا شروع کیا ــــ موٹے موٹے قہقہے لگاتے ہوئے مچھر! ــــ اور پھر گرد دھانی کی سلیں کی سلیں اس پر ٹوٹ پڑیں۔

صبح اس نے چاہا رانی کی چٹیا اسیٹ کر اس سے پوچھے حرامزادی یہ رات کہاں گئی تھی ــــ مگر کوئی کہے گا کہ وہ راتوں کو اس کا پلنگ کیوں ٹٹولتا ہے۔

وہ چپکا کام کرتا رہا۔ اور رانی بھی آج نہ بولی۔ وہ چاہتا تھا کچھ تو بولے۔ شاید رات کے اڑنے کا پتہ چلے مگر وہ منہ بنائے روٹھی بیٹھی رہی۔

"کیوں کیا تھک گئی ہ؟ ــــ" اس نے اسے ٹکٹکی رکھتے دیکھ کر نرمی سے

پوچھا۔ آج وہ اس سے لڑنا نہ چاہتا تھا۔

"اور کیا ——— میں سٹی کی بنی ہوں؟ ———" وہ اپنی کمر دونوں ہاتھوں سے دبانے لگی۔

چودھری کا جی چاہا کوئی نرم سی بات کہے۔ مگر اسے اپنا انداز بدلتے ذرا شرم آئی۔

"لے بس اب سستا چکی ———" وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ لڑے گی اور ——— خیر مگر رانی نے مٹکی اٹھا کر پھر جسم کو ویسے ہی اکڑا لیا۔

آج رنگ تنتنا اٹھے۔ جو رنگ لگایا منہ چڑانے لگا ——— آج اس نے سوچا تھا تِل بھی بنا دے گا۔ یونہی ——— تصویروں میں کیا تل نہیں ہوتے۔ مگر رنگوں کے مزاج بگڑے دیکھ کر وہ ٹال گیا۔

جب رانی اٹھ کر چلی تو گڑدھانی کا ٹکڑا اس کی دھوتی میں سے گر پڑا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ مگر چودھری کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سر پر سائبان ٹوٹ پڑا۔

"یہ ——— گڑدھانی ——— !" اس نے غصے سے جھاگ اڑانے شروع کئے۔ پہلے تو وہ رکی کہ اٹھالے۔ مگر چودھری کے تیور دیکھ کر وہ چل دی۔

"تم کھالو ———" اس نے غرور سے گردن اٹھا کر کہا۔

چودھری پر پھر مرگھٹ کا بھتنا سوار ہو گیا ——— وہ رانی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا ——— اور پھر ایک دم جوتے کی ایڑی سے اس نے گڑدھانی کو زمین پر رگڑ کر پیس ڈالا!

دوسرے دن رانی خدا جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اس نے دو چار کپڑے لینے کی بھی تکلیف گوارا نہ کی۔ جیسی آئی تھی ویسی ہی پھر موت کیچڑ میں رلنے کے لئے چل پڑی۔

چودھری کی تصویر نامکمل ہی رہ گئی! پانچ ہزار روپے ایک سیاہ دھبے کی صورت میں اس کے دماغ پر جم گئے ——— سیاہ دھبہ جیسے ننھا سا ابھرا ہوا تل ——— مگر کتنی

بری جگہ تھا یہ سیاہ جلا ہوا نشان ـــــ بالکل چودھری کے کلیجے میں!

اس کے بعد وہ اور بھی پریشان رہنے لگا ـــــ ڈر کے مارے وہ کسی سے کہتا بھی نہ تھا کہ رانی بھاگ گئی۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی کہہ نہ کہ آخر بھاگ گئی تو کیا ہوا، وہ کیوں مرا جاتا ہے۔ لہذا دن گذرتے گئے، وہ تصویریں بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اب کوئی چھ چھ آنے میں بھی اس کی تصویریں نہ لیتا تھا۔ کیونکہ وہ اس قدر بھدے، ڈراونے، سیاہ، بھورے اور کالے رنگ شفق اور پھولوں میں بھرنے لگا تھا کہ لوگ اسے الو سمجھتے تھے۔ اس کے سارے رنگ گڈمڈ ہو کر خلا میں تبدیل ہو چکے تھے۔

اس کے بعد اور بھی غیر دلچسپ واقعات پیش آنے لگے۔ لوگ رانی کے متعلق اس سے بار بار پوچھتے، وہ کہہ دیتا نہ جانے کہاں گئی۔ مگر لوگ ایسے سیدھے سادے جواب کو کب پسند کرتے ہیں ؟

"چودھری رانی کو بیچ آیا"۔

"ایک سوداگر آیا تھا جو کئی ہزار دے کر لے گیا"۔

"رانی سے برا تعلق تھا ـــــ ناجائز ـــــ کہیں پار کر دیا ـــــ"۔

جتنے منہ اس سے دو دنی باتیں۔ چودھری کی زندگی اندھیری کوٹھری بن گئی۔ معلوم ہوتا تھا دنیا اسے تل کے کھا جانا چاہتی ہے۔ یہی نہیں، لطف زندگی تو جب آیا جب رانی ایک چھوٹی سی خون آلود گٹھڑی ایک الگ سے راستے میں رکھتی ہوئی پولیس کے ہتے چڑھ گئی۔ فوراً گاؤں پر چڑھائی ہوئی اور چودھری کے رہے سہے حواس گم ہو گئے۔ رانی کے گم ہونے کا عقدہ بالکل آسانی سے کھل گیا۔ اور چودھری ہکا بکا منہ پھاڑے رہ گیا ـــــ اُف اس کی ساری عمر کی پاک بازی اور نیک نیتی یوں ناانصافی اور اندھا دھند کے ہاتھوں کھل گئی ـــــ نہ جانتا تھا کہ خدا کو خواہ مخواہ کا اس سے بیر نہیں، وہ ایسے صاف بچ جائے گا جیسے ـــــ جیسے سب بے گناہ بچ جاتے ہیں۔ سانچ کو آنچ کہاں ـــــ مگر کاش وہ شریک

جرم ہی رہتا ـــــ تو پھر وہ مجرم ہی رہتا ـــــ یوں تو وہ مجرم تھا ہی آخر اس نے پیدا ہو کر کون سا کم جرم کیا تھا۔

ہاں تو کاش وہ شریک جرم رہتا ـــــ قید بھگتتا ـــــ مصیبتیں، دکھ، درد بپتا ـــــ دنیا بھر کی ذلتیں اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ ہنس ہنس کر گود میں لپک لیتا۔ اسے پتہ ہوتا کہ وہ یوں چھوٹے گا تو وہ کیوں گڑگڑا کر خدا کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کر کے دعا مانگتا ـــــ ہاں یہ تو تھا کہ ـــــ ذرا تل ـــــ ہاں خیر! مگر خدا کیا اپنے بندوں کی کمزوری کو نہیں جانتا۔ اسی نے یہ ساری کمزوریاں انسان کے پیچھے لگا دی ہیں ـــــ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ جب رانی سے باز پرس ہو گی اور سرکاری وکیل چاروں طرف سے چودھری کو منطق کے جال میں گھیر لے گا تو وہ یہ داؤں چلے گی ـــــ اور یوں اسے آزاد ـــــ یا دوسرے معنوں میں برباد کر دے گی۔

"چودھری کا نہیں تھا ـــــ" اس نے بھری کچہری میں حلف اٹھا کر کہہ دیا۔

"چودھری تو ہجڑا ہے ـــــ" اس نے لاپروائی سے کہا ـــــ رتنا سے پوچھو یا چُننی سے ـــــ اب مجھے کیا معلوم ـــــ واہ"۔ وہ اپنی پرانی ادا سے اٹھلائی۔

ایک خاموش گرج اور چمک کے ساتھ سیاہ پہاڑ چودھری کی ہستی پر پھٹا اور دور دور ـــــ سیاہی میں اور بھی سیاہ گول ـــــ ابھرا ہوا نقطہ پھرکی کی طرح گھومنے لگا ـــــ!

چودھری اب بھی سڑک کے کنارے بیٹھا کوئلے سے لکیریں کاڑھا کرتا ہے۔ لمبی ـــــ تکونی ـــــ گول ـــــ جیسے جلا ہوا داغ ـــــ!

دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گرویدہ بنا دیا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بے کار کتابیں جو نظر آئیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں۔ "گھر کی مرغی دال برابر" والا مضمون۔ گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں۔ مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا۔ یہ ادب نہیں پھکڑ، مذاق، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہوں گی۔ یعنی بے پڑھے رائے قایم۔ مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خود ستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون "یکہ" نظر آیا۔ میں اور عظیم پڑھنے لگے نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہم

پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آ گئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے۔ مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منہ بنانے لگے۔ وہ ایک ہوشیار تھے بولے "لاؤ میں تمھیں سناؤں"۔ اور یہ کہہ کر دو ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہو گئی۔ ایک تو ان کے مضمون اور پھر ان کی ہی زبانی۔ معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔ جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے:۔

"تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں ـــــ" اور انھوں نے چھیڑا۔ ہمارے منہ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے۔ اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہو گئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی۔ حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے۔ مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور بخدا جب وہ شخص کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز، کیسی کڑوی مسکراہٹ اور کٹتے ہوئے جملے۔ میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔

کبھی کہتے تھے کہ "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو"۔ اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے۔ اس لئے جی جلتا تھا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہو گئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ اُفوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے ان رلنے والی کتابوں میں۔ ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش

کرتی ہوئی آنکھیں۔ وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال، وہ پیلی نیلاہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے ہونٹ۔ جن کے اندر قبل از وقت ٹوٹے ہوئے ناہموار دانت اور وہ لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسی نازک دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آگیا تھا۔ تپلی تپلی کھچی جیسی ٹانگیں جن کے سر پر ورم سے سوکھے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے۔ اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا کلیجے پر ہزاروں کپڑوں بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت ہے یا جن جو سر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے۔ نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ خدا قہار و جبار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمہ کا عذاب نازل کر رہا ہے۔ اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کون سا دنیا و دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچار رکھا تھا۔ مگر پھر بھی نہ رلا سکا۔ اس دکھ میں جلنا، ہنستے نہیں ہنساتے رہنا کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے۔ "زندہ لاش" خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جاندار بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل! اس میں کتنی جان تھی، منہ پر گوشت نام کو نہ تھا مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آجانے سے چہرہ خوبصورت ہو گیا تھا۔ کنپٹیاں بھر گئی تھیں۔ پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے۔ ایک موت کی سی جلا چہرہ پر آئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آگئی تھی جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی۔ اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی

شدت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں۔ ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بکس ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آ جاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص، پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ "خانم" پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں۔ ان میں اتنی جان ہی کب تھی۔ مگر وہ ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیل مجسمہ ہے۔ جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا، کودتا، دوڑتا ہوا دیکھتا ہے ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی خانم اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لئے خانم کچھ بھی نہیں۔ لیکن سوائے لکھنے والے کے باقی کے سارے کیرکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھابی جان۔ نانی اماں، شیخانی، والد صاحب بھتیجے، بھنگی، بہشتی، یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لئے اکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہم ہلتے جلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ خانم کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں۔ اور مصنف خود ہ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔

"کھرپا بہادر" جس کا پہلا ٹکڑا "روح لطافت" میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہان کی شرارتیں کروالیتا ہے۔ وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا۔ لیکن ہمزاد چوریاں کرتا شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا، مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا

کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھاکر کمر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہئے نا جینے کے لئے۔

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو، بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی۔ ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصہ بڑھتا، مگر بے بس۔ سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انھیں بھی انسان سمجھے۔ انھیں بھی کوئی ڈانٹے۔ انھیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان۔ چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہو گئی۔ اچھا خاصہ گھر میدان جنگ بن گیا اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے اور کمزور لاچار، ہر دم کا روگی تھیٹر کا ویلن ہیرو بن گیا۔ اور کیا چاہئے۔ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہو گئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انھیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا۔ اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے، ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے

کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی "سانپ جنا تھا میں نے!"

مرنے سے پہلے قابلِ رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں، جی چاہتا تھا کہ جلدی سے مر چکیں۔ آنکھوں میں دم ہے مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذاب دوزخ بن گئے ہیں۔ ہزاروں کہانیوں اور افسانوں کا ہیرو ایک ولن بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا اب بھی کوئی اسے پیار کرے۔ بیوی پوجا کرے۔ بچے محبت سے دیکھیں، بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگالے۔

ماں نے تو واقعی پھر کلیجہ سے لگالیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی۔ مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہو گئے۔ ورم بڑھ گیا آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا۔ اس کے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی۔ انسان کس قدر پرہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔ صبح چار بجے آج سے ۴۲ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا وہ زندگی کا تماشا کھیل چکا تھا۔ ۲۰/اگست کو صبح چھ بجے شمیم نے آکر کہا "منٹے بھائی ختم ہو رہے ہیں اٹھو"۔

"وہ کبھی بھی ختم نہ ہوں گے ــــ بے کار مجھے جگا رہے ہو ــــ" میں نے لٹکر صبح کی ٹھنڈی ہوائیں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

"ارے کمبخت تجھے یاد کر رہے ہیں ــــ" شمیم نے کچھ پریشان ہو کر ہلایا۔

"ان سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے ــــ ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے۔" میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔

سارا کوڑا، کرکٹ، کتابیں ہٹادی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ دو ننھے بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تاک رہے تھے۔ بھابی انھیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں۔ سوکھی سوکھی آہیں ان کے کلیجے سے نکل رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

"منے بھائی"۔ میں نے ان پر جھک کر کہا۔ ایک لمحہ کو آنکھیں اپنے محور پر رکیں ہونٹ سکڑے اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی۔ ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹہ تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں۔ جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منے بھائی ـــــ" نہ جانے کس نے کہا۔

"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے"۔ مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں ناممکن وہ کبھی نہیں مر سکتے۔ ان کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لئے تو وہ مر کر ہی جیئے اور نہ جانے کتنوں کے لئے وہ مرنے کے بعد پیدا ہوں گے اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے، ان کا پیغام "دکھ سے لڑو۔ نفرت سے لڑو اور مر کر بھی لڑتے رہو"۔ یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان کی صحت اچھی ہوتی۔ وہ جھوٹے تھے۔ ان کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو دکھ دیا۔ بیوی کو دکھ دیا، بچوں کو دکھ دیا۔ اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب دنیا بن کر نازل ہوئے تھے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار تو ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیراندازوں کو کڑوے

تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا یکھ نہ چٹا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔
بس میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی
جل اٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہوں گے۔
ہڈیاں مٹی میں حل رہی ہوں گی۔ ملاؤں کے فتوؤں سے اس کی گردن دب رہی ہوگی۔
آروں سے اس کا جسم چیرا جا رہا ہوگا۔ مگر وہ ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ
رہی ہوں گی نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہوں گے۔ مگر کوئی اسے رلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی باہیں
انجکشنوں سے گدی ہوئی، کولھے میں امرود برابر پھوڑا۔ آخری دم اور چیونٹیاں جسم میں
لگنا شروع ہوگئیں، کیا ہنس کر کہتا ہے۔ "یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی
قبل از وقت اپنا حصہ لینے آن پہنچیں ——" یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا۔ دل چاہئے
پتھر کا کلیجہ ہو۔ مرتے وقت جملے کسنے کے لئے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک لفظ ہو جو یاد آئے پوری کی پوری کتابیں
ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن! بنا آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا۔
اور زبان تھی کہ قینچی۔ اس قدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دنیا بدل گئی ہے، خیالات بدل گئے
ہیں، ہم لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہم دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں، سرمایہ داری،
سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے
ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے، نادار
بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے
تھے۔ دکھ میں ٹھٹھہ لگا لیتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں

ہنس کر دکھ کو نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو۔ اس سے دوستی۔ گھر پا بہادر میں جو شاہ لنگر ان کے حالات ہیں وہ ایک میراسن سے معلوم ہوئے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراسن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اسی میراسن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن، بہشتن، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں رہے۔ وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی۔ آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اڑایا کرتے۔ ہزاروں قصے سنتے اور سناتے۔ وہی قصے "سوانہ کی روحیں" "مہارانی کا خواب" "چھمکی" اور "بڑہ بڑے" بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے۔ اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں بہت سی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات کو یقین کرتا تھا۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول ہی۔ خصوصاً "کولتار" تو بالکل ردی ہے مگر ان میں بھی حقیقت کو اصلی صورت میں گڑبڑ کر کے رکھ دیا ہے۔ "شریر بیوی" تو بالکل فضول ہے۔ مگر اپنے زمانے کی بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

"چھمکی" ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ اُفوہ، وہ چھمکی کی خاموش نگاہوں کے پیغام۔ وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا۔ اور پھر خود مصنف کی زندگی ــــ کس قدر مکمل جھوٹ۔ یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد ہوتا تھا۔ جو ان کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کرتا ہے۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں۔ یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔

جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں گل بکاؤلی، زہر عشق وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں۔ اور پھر انھیں پرانی کہہ دیا گیا۔ لیکن اب یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اتار چڑھاؤ پنڈلیوں کی گاؤدمی، رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے۔ وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ "نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں "اماں کھانا" معلوم ہوتا ہے"۔ یہ بھی کہا کرتے کہ ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہیں۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری مصوری قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہو کر وہی "الف لیلہ" کا رنگ غالب آ گیا۔

انھیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا۔ (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کھول کر مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے۔ "یہ عورت بہت پیارے جھوٹ بولتی ہے"۔ انھیں شکایت تھی کہ میں بہت ہی الٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں۔ میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں! اور ان کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں! اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے انسانوں کو عموماً "جھوٹ" کہا کرتے تھے۔ جہاں انھوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے۔ پھر "قصر صحرا" لکھنے لگے؟ وہ ان کی گپوں کو "قصر صحرا" کہتے تھے۔ عظیم بھائی کہتے تھے "سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو"۔

وہ یہ بھی کہتے تھے "جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو "قصرِ صحرا" ہے"۔
اس پر ماموں کہتے :۔
"ارے اس زندہ لاش کو منع کرو کہ یہ کفر ہے"۔ اس پر وہ ماموں کے تو تم پر سسرال والوں کا مسخرا اڑاتے تھے۔

انھیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کہتے تھے دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزیدار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزیدار ہے۔

کہتے تھے۔ "مری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر بجوا دیتا۔ بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔ مزے سے آمدنی ہوتی ـــــ"

انھیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے "دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں۔ عقل چاہئے ان چیزوں کے لئے ـــــ"

انھیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا۔ مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں ان کا۔ عموماً پیسے دے کر ڈھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انھیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انھیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے کچھ نہیں قانونی کتاب ہے۔ جھوٹ تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لئے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مداح تھے۔ اور امام حسین کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ امام حسین کھڑے ہیں، ادھر سے یزید لعین آیا آپ کے پیر پکڑ لئے گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش مارنے لگا اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اس دن سے یزید کی عزت شروع کر دی۔ جنت میں تو ان کا ملاپ بھی ہو گیا، ہم پھر کیوں لڑیں ــــ"
سیاست سے کم دلچسپی تھی۔ کہتے تھے۔ "بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ۔ اور یہاں کمبخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔ بہت سال ہوئے کچھ مضامین ریاست میں سیاسیات اور اکنامکس پر لکھے تھے، وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا۔ مگر آخر میں آکر بحث کم کر دی تھی اور کہتے تھے۔

"بھئی تم لوگ تو بٹے کٹے ہو اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ، جنت سب نکل آئیں تو کیا کروں گا ــــ لہٰذا چپ ہی رہو ــــ" پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے۔ مگر آخر میں کہتے تھے۔ "یہ پرانی بات ہو گئی۔ اب پردہ روکے سے نہیں رک سکتا۔ اس معاملہ میں ہم کر چکے ــــ اب تو نئی پریشانیاں ہیں"۔ لوگ کہتے تھے دوزخ میں جاؤ گے، تو فرماتے "یہاں کون سی اللہ میاں نے جنت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پروا نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بے کار جائے گا۔ کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں ــــ" کبھی کہتے تھے "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مر جائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ سب انھیں باغی اور دوزخی کہتے ہیں۔ وہ کہیں پر بھی جائیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی ان کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں۔ یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے

الجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ہے۔ ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ دوزخی کا کیا ٹھکانا۔

چھوٹی آپا

کون نہیں جانتا کہ چوری بری ہوتی ہے۔ پر بعض چوریاں ایسی مزے دار ہوتی ہیں کہ نیت بھٹک ہی جاتی ہے۔ پوشیدہ خطوط، پرانی کتابیں اور کاپیاں اور ہزاروں چھپی ڈھکی چیزیں جنھیں لوگ کپڑوں کی تہوں کے نیچے چھپا کر رکھتے ہیں۔ یہ چیزیں اگر ہاتھ لگ جائیں تو پھر کیا کہنے!

موسم غیر معمولی گرم اور غم آلود تھا اور یونہی چھوٹی آپا کے لکچروں سے اکتا کر میں پرانی کتابیں ٹٹولنے لگی۔ چھوٹی آپا کتنی ہوشیار تھیں! پروفیسروں نے کس قدر اچھی رائے ان کے بارے میں دی تھی! مجھے کچھ رشک ہونے لگا، پچھلے مہینے تو پرنسپل نے کچھ مشتبہ سا جملہ میرے کارڈ پر لکھ دیا تھا۔ جسے دیکھ کر چھوٹی آپا نے لکچر پلانے شروع کر دیئے۔ "وحشی ہو گئی ہو۔" "احساس مرگیا ہے۔" "الٹی سیدھی کتابوں نے دماغ خراب کر دیا ہے۔" "تھالی کا بینگن ہو، جدھر ڈھال دیکھا ادھر لڑھک گئیں۔" اور نہ جانے کیا کیا۔ جی چاہا لڑ پڑوں کہ تم کون ہوتی ہو، ہمارا جو جی چاہے گا کریں گے!" کہ میری نظر چند بوسیدہ کاغذوں میں الجھ گئی۔ ادہو چیز تو کام کی تھی ——— چھوٹی آپا کی ڈائری!

بیچ بیچ میں سے کچھ صفحے غائب تھے۔ مگر ایسے نہیں کہ افسانے کو بگاڑ دیتے۔ ذرا سی

محنت سے میری پیاری بھتو کا سارا پول کھل گیا
پہلے ہی صفحہ پر لکھا تھا:-

۱- آج نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کسی سے سر جوڑ جوڑ کر باتیں کروں! آپا جان اپنی سہیلیوں سے کیسی کھسر پھسر کرتی ہیں! کیا باتیں کرتی ہیں۔ کیا ان کے دل میں بھی جھمکیں سی اٹھا کرتی ہیں؟ کیا ان کے بھی دماغ میں ایسی میٹھی میٹھی باتیں رینگا کرتی ہیں؟ مگر میری باتیں کون سنے گا؟۔ شمو کتیا تو ضرور ہنسے گی اور جا کر آپا جان سے جڑ دے گی۔ اور وہ جھٹ اماں سے کہہ دیں گی اور اماں کے پیٹ میں تو کوئی بات ٹکتی نہیں، وہ لاڈ میں آکر ابا کو بتا دیں گی۔ اور پھر میرا خواب پرزہ پرزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ نا بابا! پر آج تو کسی سے ضرور کہوں گی۔ سب کچھ کہہ دوں گی۔ اور کسی سے کچھ نہیں تو اپنے تکیہ ہی میں منہ چھپا کر سب کچھ کہہ دوں گی۔ اور برسوں کی بوسیدہ روئی میں یہ سہاؤنے سپنے ڈوب کر بس جائیں گے۔ پر اماں کو پرانے تکئے ادھیڑنے کی بڑی لت ہے ـــــ پھر؟ پھر تو یہ کہانی دانہ دانہ ہو کر بکھر جائے گی۔ بات یہ ہوئی کہ آج میں کالے پلے کی گردن میں ڈوری باندھ رہی تھی، کہ جناب نہ جانے کدھر سے آگئے۔

"ارے یہ غریب کو کیوں پھانسی دی جا رہی ہے؟"

میرا ہاتھ ڈھیلا ہوا تو پلا بھاگ گیا۔

"اور کوئی تمھارے گلے میں رسی باندھے تو؟" انھوں نے لے کے میری گردن ہلا دی اور میں وہاں سے بھاگی۔

مجھے چھوٹی آپا کا رومان پڑھ کر سخت ہنسی آئی۔ مگر آگے لکھا تھا:-

۲- تو میں کیا کروں۔ بھیا کے لئے دودھ لے جا رہی تھی کہ ادھر سے آگئے۔
"اب بتاؤ کدھر بھاگو گی؟" میرے آگے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ برش سے گالوں پر صابن لگا رہے تھے۔ لے کے میرے بہت سا لگا دیا۔

۳۔ اماں کہتی ہیں شوکت بڑا شرمیلا ہے۔ بڑا شرمیلا! کیا آنکھیں بناتا ہے کہ بس! اماں کو کوئی ایسی آنکھوں سے دیکھے تب پتہ چلے۔ ایسا جی گھبرانے لگتا ہے۔ رات کو گیلری میں ڈرا دیا۔

"لوگ تو ہمیں دیکھ ایسے بھاگتے ہیں جیسے ہم کھا ہی تو جائیں گے۔ اور جو ابھی ابھی ہم ——" میں سرپٹ بھاگی وہاں سے۔ دل کیسا دھک دھک کرنے لگا۔ جی چاہا روؤں مگر رونا نہ آیا۔ کھانے پر لیمپ کی آڑ میں بیٹھی۔ کوئی میں کسی سے ڈرتی ہوں۔ چوہیا سے تو یوں ڈر لگتا ہے کہ بھئی وہ پھدکتی ہے۔ اور "انھیں" دیکھ کر سارے جسم میں چوہیاں سی پھدکنے لگتی ہیں۔

آج تو میں نے پانی بھی پلا دیا اور سویٹر بننے کا وعدہ بھی کر لیا۔ وعدہ کیا جی آدھا پچھایا رات کو بنا —— اماں کہتی ہیں اتنی رات تک بجلی جلاتی ہوں۔ تیرہ روپے کا بجلی کا بل آیا ہے۔ ان کی لاڈلی آپا رات رات بھر الٹی سیدھی کتابیں پڑھے تو بجلی کا بل تیرہ روپے کا نہیں آتا۔

۴۔ جہاں بیٹھتی ہوں آن گھستے ہیں۔ اور کیا چپکے چپکے چٹکیاں نوچتے ہیں! اماں کہتی ہیں لڑکوں کے پاس گھس کر نہیں بیٹھا کرتے۔ مگر یہ کمبخت لڑکے مانیں بھی۔

۵۔ خالہ اماں کہتی ہیں۔ بڑی بے شرم ہوں۔ شادی بیاہ کی بات میں پٹاپٹ بولتی ہوں۔ پھر یہ کیا بات ہے؟ کتنی دفعہ کوشش کی مگر زینہ سے لوٹ لوٹ آئی۔ جو ہزار دشواریوں سے اوپر پہنچی بھی تو جلدی الماریاں ٹٹولنے لگی جیسے کوئی چیز ڈھونڈ رہی ہوں۔ سچ تو ہے اپنے کھوئے ہوئے حواس ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ بھی کچھ نہ بولے تو بھاگی وہاں سے۔

"ذرا سنو تو ——" مگر میں کہاں، دو چار بے کار کپڑے اٹھا لیے۔

"ابھی آتی ہوں ——" اور نیچے بھاگی۔ اب نیچے اتر آئی تو اللہ واپس کیسے

چڑھوں جیسے پل صراط ہی تو چڑھنا ہے۔ زینے کے پاس چکر کاٹ رہی ہوں۔ مگر مجال نہیں جو سیڑھی پر قدم رکھوں۔ بھنگی سیڑھیاں پوچھنے کے لئے آ گیا۔ لو چلو چھٹی ہوئی۔ پھر ہمت کی۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ طوطا بولا۔ "مٹھو" گرتے گرتے بچی۔ پاپی کہیں کا۔ ایسے بلی بھی تو نہیں کھا جاتی، اور پھر جو ارادہ کیا تو لیجئے ادھر سے اماں آئیں میں گھبرا کر اچھے بھلے کرتے کا گریبان ادھیڑنے لگی۔

"ادئی۔ یہ اچھے بھلے کرتے کا گریبان کیوں ادھیڑ رہی ہے"۔ وہ ایسے کھرے پن سے بولیں کہ ہی بیٹھ گیا۔

"تنگ ہے"۔ اور میں ایسے نوچنے لگی جیسے گریبان میرے حلق میں پڑا دم گھونٹ رہا تھا۔

"اچھا خاصا ہے۔ اب کاٹ پیٹ کر ہنڈا سا کر لینا کہ آدھا سینہ نظر آئے۔ زہر ہی لگتے ہیں۔ مجھے یہ پھاٹک کی وضع کے گلے ـــــ" اور وہ ناک سکیڑ کر عین سیڑھیوں کے آگے بیٹھ گئیں۔ نہ جانے ان اماں سے ابا نے کیسے نباہ کیا۔ خوب ہوتا جو راحت خالہ سے نکاح کر لیتے! اور وہ تین سال کے لئے جا رہے ہیں۔ نہ جانیں کب آئیں!۔

۶۔ وہ چلے بھی گئے۔ اماں نے گلے لگایا۔ آپا نے پیار کیا۔ یہ آپا کے خوب مزے ہیں۔ کیا بہانے سے رشید بھائی سے گپیں مارتی ہیں کہ حد نہیں۔ ذرا کمرے میں جاؤ تو کود کر بھاگتی ہیں۔ نہ جانے کیا کرتے ہیں۔ دونوں، اور کوئی نہیں پوچھتا بنو بی کتنے دانت ہیں تمہارے منہ میں!

۷۔ زندگی کے چند سادہ ورق الٹ رہی ہوں! مجھ سے اتنا سبق یاد نہیں ہوتا۔ ہسٹری، جغرافیہ اور ستر ہ سوال۔

۸۔ آج محمود کے ساتھ سینما میں گئے۔ پچھلی دفعہ کا جانا یاد آگیا۔ ایک ہی موٹر میں ہم سب بھر گئے تھے۔ ان کا ہیٹ میری گود میں رکھا تھا۔ جسے وہ بار بار تلاش کرتے

تھے۔ سگریٹ کی بو پیڑول میں مل کر کتنی عجیب ہو جاتی ہے۔ یہ محمود نہ جانے کون سے سگریٹ پیتا ہے۔ جلے ہوئے اپلوں جیسی بو آتی ہے۔

۹۔ محمود کتنا عجیب ہے ؟۔

۱۰۔ کھانا کھاتے میں محمود کے پیر ساری میز کے نیچے ناچتے ہیں۔ جب دیکھو سانپ کی طرح رینگ رہے ہیں۔ اور جیسے بچارے کو معلوم ہی نہیں۔ کیا بھولا بنا سر جھکائے کھاتا ہے مگر پیر ہیں جیسے رسیوں کے پھندے الجھے ہیں۔

۱۱۔ دہلی کا سفر بھی خوب رہا۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے پیر ٹوٹ گئے۔ یہاں لفٹ کیوں نہیں لگوا دیتے۔ کس قدر اندھیرا ہے کہ اللہ توبہ!

محمود کے پیر ہی نہیں ہاتھ بھی رینگتے ہیں !

۱۲۔ انھوں نے عید کا تحفہ بھیجا۔ ناک میں پہننے کی کیل! انھیں دنیا میں اور کوئی تحفہ نہ جڑا۔ میری تو ناک کا سوراخ کبھی کا بند ہو گیا۔ محمود کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ سارا دن مجھے کاغذ کاٹنے کی مشین، بورے سینے کا سوا اور مشین کا پیچ کش دکھا دکھا کر ناک چھیدنے کی رائے دیتا رہا۔ میں نے تو یونہی لکھا کہ بیکار ہے اور اس نے لکھ دیا۔ بیکار ہے۔ کیونکہ یہ لڑکی معمولی کیل سے قابو میں نہیں آنے کی۔ اس کے لئے تو کوئی زبردست موٹی سی نکیل بھیجو"۔

ایسا تحفہ بھی کیا!

۱۳۔ شوکت کا خط کتنا دلچسپ ہوتا ہے۔ واہ واہ گویا کوئی معمہ حل کر رہے ہیں۔ اس قدر گول مول باتیں کہ جی الجھ جاتا ہے۔

۱۴۔ محمود کہتا ہے کہ ایک ہفتہ میں تیرنا سکھا دوں گا۔ رات میں سمندر کا پانی کیسا اژدہے کی طرح پھنکاریں مارتا ہے کہ کلیجہ کھنچنے لگتا ہے۔ محمود کمبخت ہر وقت ڈبونے کی دھمکی دیتا رہتا ہے۔ سارا نیا نہانے کا لباس پھٹ گیا۔ نیلا اون لانا ہے۔

۱۵۔ شوکت نے لکھا ہے کہ زندگی ایک گاڑی ہے۔ مجھے ان موٹی بیوی کا خیال آتا ہے جو زینہ پر چڑھنے کے لئے للچاتی ہیں۔ شوکت کہتے ہیں زندگی گاڑی ہے جس کے لئے دو پہیوں کی ضرورت ہے اور وہ دو پہئے میں اور شوکت ہیں، مجھے تو خیال سے ہی پھریریاں آتی ہیں۔ کیسے چلے گی یہ گاڑی۔ کوئی میں بیل ہوں، واہ۔

۱۶۔ کرکٹ میچ دیکھنے گئے۔ میرا تو دل گھبرا جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے معلوم ہوتا ہے بولر ہر دفعہ میری ہی ناک کا نشانہ باندھ کر گیند پھینک رہا ہے۔ عسکری کی وجہ سے بیٹھنا پڑا۔ کمبخت کے ہاتھ کتنے سخت ہو گئے ہیں۔ ایسے زور سے دباتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے انگلیاں توڑ کر رکھ دے گا۔

۱۷۔ آج عسکری کی موٹر سائیکل پر سیر رہی۔ محمود صاحب جلے۔ جلا کرو ——— بلا سے۔

۱۸۔ عسکری نے میرا بازو جلا دیا۔ سگریٹ سے۔ اور پھر چلے علاج کرنے۔ میں نے کہا معاف رکھئے۔

بولے۔ "سچ کہتا ہوں دو سکنڈ میں ——— اچھا محمود سے کہنا وہ بڑا ماہر ہے۔"
میں نے ایک تھپڑ لگایا۔ اس قدر بکواس کرتا ہے، کل کھانے پر آئے گا۔

۱۹۔ عسکری کے ساتھ سائیکل پر سیر رہی۔ دور تک نکل گئے۔ کبھی کبھی زندگی بھی کس قدر خوشگوار ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے خود کو اس کے چلبلے دھارے پر چھوڑ دوں اور دنیا ساکت ہو جائے۔ کان گنگ ہو جائیں اور آنکھیں بند اور کچھ نہ سنائی دے۔ کائنات کا پتہ پتہ سو جائے اور صرف دو دلوں کی دھڑکن گونجتی رہے اور سب کچھ ڈوب جائے۔ نیلا رومال نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ عسکری نے گلے میں باندھ لیا تھا۔ کس قدر زیال اڑتے ہیں۔

۲۰۔ عسکری آج بھی رومال بھول آیا۔ محمود سے دو دفعہ لڑائی ہوئی۔ وہ امتحان

میں فیل ہوئے تو کیا میں نے کہا تھا کہ بجائے پڑھنے کے مجھے الجبرا سکھاؤ۔

۲۱۔ شوکت کی منگنی رضیہ سے ہوگی۔ کچھ دل دکھا۔ توبہ توبہ۔ کتنی کمبخت ہوں میں۔ وہ بچارے اب بھی نہیں کرتے تھے۔

۲۲۔ عسکری جب گیند پھینکتا ہے تو اس کی صورت کس قدر بے رحموں جیسی ہو جاتی ہے، دانت بھینچ کر، بھنویں سکیڑ کر۔ ریشمی قمیص ساری پسینے کی وجہ سے جسم سے چپک گئی مگر یہ محمود کی ناک پر کتنا پسینہ آتا ہے۔ دیکھ کر ہی گھن آتی ہے۔

۲۳۔ تارہ کس قدر بد معاش ہے عسکری کو دیکھتے ہی مرنے لگیں۔ عسکری جیسے ان کے قصے سن تو نہیں چکا ہے۔ اللہ کون لڑکا ہے جس پر یہ مر نہیں چکیں۔

۲۴۔ دو دن سے عسکری نہیں آیا۔ پتہ نہیں۔ کہتے ہیں دہلی گیا ہے۔

انسان کتنے دن دنیا میں رہتا ہے اور خود کو زندہ سمجھتا ہے۔ لیکن ایک جھٹکا لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے دنیا کیا ہے۔ زندگی زندگی ہی سے ملتی ہے، جب پتھر پتھر سے ٹکراتا ہے آگ بھڑک اٹھتی ہے جو جلا کر خاکستر بنا کر ہی اصل معنوں میں زرخیز بناتی ہے کہ سرسبز جنگل لہکنے لگتے ہیں۔ اور عسکری تو ایک چٹان ہے آتش نشاں۔

۲۵۔ کیوں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دنیا میں بس ایک عسکری کی نیلگوں آنکھیں کیوں چھائی ہوئی ہیں۔ چھ مہینے کے دورہ پر گیا ہے۔ مگر چھ مہینے کتنے لمبے ہو گئے ہیں۔

۲۶۔ یہ مرد بھی کیسے طوطا چشم ہوتے ہیں۔ طوطے کی آنکھیں تو پھر بھی پل بھر کو ایک ہی محور پر قایم رہ جاتی ہیں۔ مگر ان کی نیلی، کالی، بھوری، پیلی آنکھیں تو گھومتا ہوا لٹو ہیں جن کی کوئی سمت نہیں۔ ہر سمت قبلہ ہے۔

۲۷۔ دونوں خط واپس لوٹ آئے۔ عسکری شاید یورپ کے ٹور پر گیا۔ کس طرح گیند پھینکتا ہے جیسے چبا ہی توڈالے گا۔ یہ پھینکنے کی عادت بھی خوب ہے۔ لیا، دبوچا۔ اچھالا اور پھینک دیا ـــــ لیجئے پھر دوسری گیند آگئی ہاتھ میں۔

۲۸۔ شوکت کے بیٹا پیدا ہوا۔ یعنی مجھے کیا؟ کوئی مجھ سے تھوڑی چھین لیا گیا۔ بچہ کتنا خوبصورت ہے۔

۲۹۔ پائے مرا لنگ نیست۔ ملک خدا تنگ نیست۔ محبت کبھی کوئی چیز ہے جو کیڑوں کی خوراک بننے کے لئے قبر سڑنے کے لئے چھوڑ دی جائے۔ عشق تو ایک بے چین شعلہ ہے کہ جب اپنا عظیم الشان رقص شروع کرتا ہے تو کائنات کو اپنے آغوش میں دبوچ لیتا ہے۔ ایک بے پناہ دریا جو ابھرتا ہے تو بڑی بڑی چٹانوں کو جھیلتا۔ پیڑوں کو اکھیڑتا اور ریگستانوں کو ڈبوتا چلا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں عمر میں سچی محبت صرف ایک مرتبہ ہوتی ہے۔ مگر لوگوں یہ کبھی تو بتاؤ وہ "ایک" ہے کون؟ انسان لٹو ہے اور اسے ہر سمت قبلہ ہی نظر آتا ہے۔ عشق کی تو گدی میں بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔

ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت کتنے محمود، عباس، عسکری۔ یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دیئے گئے ہیں۔ کوئی بتاؤ ان میں سے "چور" پتہ کون سا ہے؟ شوکت کی بھولی بھولی کہانیوں سے لبریز آنکھیں محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضار۔ عسکری کے بے رحم ہاتھ، یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تل۔ عباس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں —— اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے۔ کشادہ پیشانیاں۔ گھنے گھنے بال، سڈول پنڈلیاں، مضبوط بازو۔ سب ایک ساتھ مل کر کچے سوت کے ڈوروں کی طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا سر پکڑ کر کھینچوں کہ کھنچتا ہی چلا آئے اور میں اس کے سہارے دور افق سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔

○

مڑے تڑے پرانے کاغذوں کے ڈھیر ایک حسین و جمیل زندگی بن کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے اور میں حیرت سے ان کے نقش و نگار ٹٹولنے لگی۔ چھوٹی آپا——

چھوٹی آپا برآمدے میں بچے کے دودھ کی بوتل صاف کر رہی تھیں۔ اور احمد بھائی انھیں دوستوں سے ملانے کے لئے ڈرائنگ روم میں بلا رہے تھے۔

وہ سادہ ساڑی کے آنچل سے سر ڈھانکے صوفیانہ انداز سے صوفہ پر بیٹھ گئیں۔

"میں کہتا ہوں تم اتنی شرمیلی کیوں ہو۔ آج کل کی لڑکیاں تو مردوں کے کان کاٹتی ہیں۔" اور وہ میری طرف طنز سے مسکرا کر دیکھنے لگے۔ لیکن میں چھوٹی آپا کو دیکھنے میں غرق تھی۔ جو ایک تیز گھومتے ہوئے لٹو کی طرح ساکت اب بھی کھوئی کھوئی سی نظروں سے تک رہی تھیں۔ شاید اب بھی ان کے سامنے کچے سوت کے ڈوروں کا انبار لگا ہوا تھا اور وہ قدم تول تول کر کوئی مضبوط سرا تلاش کر رہی تھیں ——

بات کو ٹالنے کے لئے میں نے احمد بھائی کے سب سے زیادہ رنگین مزاج دوست کو چائے کی پیالی پکڑا دی۔

جھری میں سے

ہے تو یہ بڑی معیوب سی بات مگر میں چھپ کر بہت سی معیوب باتیں کر لیتی ہوں۔ لہٰذا اسی اصول کی بنا پر دروازے کی باریک سی جھری میں سے اکثر جھانکا کرتی ہوں۔

"یہ بہت ذلیل حرکت ہے؟" لوگ کہتے ہیں۔

"بھئی دل جو گھبراتا ہے میرا!" میں جواب دیتی ہوں۔

میرے معقول جواب عموماً "لوگوں" کو قائل کر دیا کرتے ہیں۔ لہٰذا میں بلا خوف خدا جھری میں سے جھانکتی ہوں اور انشاء اللہ جھانکتی رہوں گی۔ کون جانتا ہے۔

تو میں پلنگ پر اوندھی پڑ جاتی ہوں۔ پیٹ کے نیچے ایک تکیہ دبائے پڑی جھانکا کرتی ہوں۔ یہ نہ سمجھئے گا میں کسی نئے بیاہے جوڑے کو جھانکنے کے لئے اس دلچسپ جھری کو استعمال کرتی ہوں۔ معاف کیجئے گا میں اتنی گری پڑی نہیں اور نہ میرے پڑوسی اس قسم کی بدعتوں کے قائل۔ بس تو پھر کیا اعتراض ہو سکتا ہے آپ کو؟

اس بے حقیقت جھری سے جام جم کا کام لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے گھر کی جھریاں معمولی جھریاں نہیں۔ یہ دیدہ و دانستہ بڑی کاوشوں سے عمارت میں خصوصیت پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو ہمارے کمرے کے پاس اور کبھی کمرے

خالی ہیں۔ مگر کرائے پر۔ آپ ان میں سے ایک کمرہ لے لیں۔ میرا مطلب ہے کرائے پر، اور مزے سے جھریوں میں سے جھانکیں۔ عمارت بہت اچھی ہے۔ صرف ایک بات ہے کہ خواہ کسی وقت آپ کسی کمرے کے کسی کونے میں ہوں سورج کی کرنیں نئے نئے زاویوں سے آپ کے جسم کو ابالنے کی کوشش کرتی رہیں گی۔ نیز جب آپ صبح اٹھیں گے تو ہلکا ہلکا سر میں درد، منہ کا مزہ خراب، اور بخار کے بعد کی سی تھکن محسوس ہوگی۔ ناشتہ پر آپ کو دبی دبی ابکائیاں آئیں گی اور بڑی عجیب و غریب اشیا بگھاریں گے۔ جن میں سے پرانے جوتوں کے ابلنے کی سی گھاس آئے گی۔ آپ دروازے مقفل کرلیں گے۔ مگر درازیں ہیں ــــــ درازیں تو قائم رہیں گی۔

ہاں تو میں انھیں دراروں میں سے ایک درار سے جھانکا کرتی ہوں۔ اللہ! کیا کیا تیری قدرت کے کرشمے ہیں! سامنے ہی ایک کرسی کا پچھلا حصہ نظر آتا ہے۔ جس پر ایک چوڑی سی تنبو کی شکل کی پتلون ہواخوری کیا کرتی ہے۔ کبھی کبھی سفید اور کبھی بھوری، یا سرمئی گویا یہ پتلون کرسی ہی کے استعمال کے لئے ہی بنی ہے۔ اس کی پشت کے نچلے حصے پر دو سموسوں کی شکل کے مثلث چپکے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے پتلون کی شکل پر کرب کی سی حالت طاری رہتی ہے۔ اس کرسی سے ذرا ہٹ کر ایک پلنگ کا پایہ نظر آتا ہے۔ اس پائے پر ایک عظیم الشان پیر کی ہیبت ناک ایڑی رکھی رہتی ہے۔ اس ایڑی کو دیکھ کر مجھے ریگستانی علاقوں کی مہیب چٹانیں یاد آجاتی ہیں۔ ان میں گہری گہری قاشیں ہیں۔ جن میں پسینے کی ندیاں سی بہ بہ کر پائے کو سیراب کرتی ہیں اور جب مکھیوں سے تنگ آکر یہ ایڑی اپنے محور پر گھومتی ہے تو بالکل ایک چھوٹا موٹا زلزلہ سا آجاتا ہے۔ پلنگ چنگھاڑتا اور پایا جھوم جاتا ہے۔ کمبخت درار اتنی چھوٹی ہے کہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اتنی دیر بھلا کون اوندھا لیٹ سکتا ہے۔ پیٹ کی نسیں اکڑ کر بائنٹے پڑنے لگتے ہیں اور میں کروٹ سے لیٹ کر کہنی کے نیچے تکیہ سرکا لیتی ہوں۔ گردن کو تھوڑا امروڑتی ہوں اور تھوڑی

میں ہاتھ کی ٹیکن لگا لیتی ہوں۔ کمرے کی دنیا انگڑائی لیتی ہے اور دو دھاری دار مسکین سی ٹانگیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان ٹانگوں کو دیکھ کر آپ کے سارے مادرانہ جذبات کھول اٹھتے ہیں۔ بے اختیار جی چاہتا ہے چپکے سے ان نیم خفتہ ٹانگوں کو لٹا دیں۔ اور آنسو بھری آنکھوں سے بیٹھے تکا کریں۔ جب بہت ہی دل بے قابو ہو تو خدا کی ہزاروں نعمتوں کو خیال میں لائیں اور ایک آہ بھر کر صبر کریں! ان پیروں کے سروں میں دو سفید اور شاعرانہ پیر مڑے ہوئے ہیں جو چنبیلی کی بڑی بڑی نیم شگفتہ کلیوں سے مشابہ ہیں اور جن پر کنول جیسی باریک سرخ نسوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان ٹانگوں کے گھٹنوں پر ایک مجبور سا ہاتھ ٹہلا کرتا ہے۔ دبے پاؤں —— ڈرپوک عاشق کی طرح کانپتا، لرزتا، جھجکتا کبھی انگلیاں، ہتھیلی سے چمٹ جاتی ہیں اور کبھی گھٹنے کی چپنی کو بھینچتی ہیں۔ ایک پراسرار قبرستانی سسکی ہوا میں لرزتی ہے۔

"ہلو —— ہلو —— مس رمولا ؟" فضا یخ بستہ ہو جاتی ہے۔ دبی دبی آہیں اور مجروح کراہٹیں نون غنہ میں لپٹی ہوئی کمرے کی بالائی فضا میں بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح تیرنے لگتی ہیں۔ گلا رندھ جاتا ہے۔ ہچکی روک کر جسم کو دوسرے زاویہ میں کھینچتی ہوں۔ اب میرا زیریں حصہ جسم جل مچھلی کی طرح خمدار ہو جاتا ہے اور بالائی حصہ پیڑے کے گدے کی طرح اکڑ جاتا ہے۔ یہ زندگی میں سب سے کٹھن بیٹھک ہے اور بڑے سے بڑے گیانی سادھو کبھی نہیں سہہ سکتے مگر میں سہتی ہوں۔ درار میں سے جھانکنے کے لئے انسان کو سبھی کچھ سہنا پڑتا ہے۔ اور اب سامنے اسٹول پر ریڈیو رکھا رہتا ہے۔ اس ریڈیو کو شاید آپ کی ساری ذہنی بیماریوں کا علم ہے۔ کیونکہ عام طور پر تو بازار کے بھاؤ سنا کر آپ کو دہلاتا ہے۔ پھر گھسے ہوئے ریکارڈ ماتم شروع کر دیتے ہیں۔ خیر! تو اس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی کھانے کی میز ہے۔ جس پر سفید چادر پڑی رہتی ہے۔ یہ میز بالکل بیوہ دلہن کی طرح اداس اور شرمیلی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے ارد گرد

بڑی شکلوں کی ہونق کرسیاں کھڑی رہتی ہیں۔ ان کی ہئیت سے بدحواسی اور سراسیمگی بھی ظاہر ہوتی ہے اور کچھ مدقوق اور تحیر سی لگتی ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کے اوپر روغن نہیں یا لکڑی گھنی ہوئی ہے۔ نہیں، یہ تو بس ویسے ہی کچھ عجیب سی نظر آتی ہیں۔ میز سے ذرا ہٹ کر ایک لمبا اور پتلا سا اسٹول رکھا ہے جس پر دو فٹ اونچا رسالوں اور اخباروں کا منارہ سا چنا ہوا ہے۔ یہ اسٹول بالکل قحط زدہ مزدور معلوم ہوتا ہے جو سرمایہ دار کی وزنی دولت کے نیچے دبا جارہا ہو۔ اگر آپ تھوڑی دیر اس اسٹول کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ اب یہ اپنی جگہ سے ہل کر بھاگا اور اب بھاگا۔

بائیں طرف ——— الماریوں کی قطاریں ہیں۔ جن میں عطار کی دکان میں سجی ہوئی بوتلوں کی طرح منوں کتابیں رکھی ہیں۔ کڑوی کڑوی دواؤں کی شکل کی لمبوتری کتابیں۔ اگر اب ذرا بھی نفیس مزاج ہیں تو آپ کو بڑے زور کی پھریری آئے گی۔

ایک الماری کے بالائی تختے پر ایک گھڑی رکھی ہے۔ چوڑی سی موٹی عورت کے چہرے کی مانند، کڑک مرغی کی طرح کٹاک کٹاک کرتی رہتی ہے، یہ گھڑی اس مکان میں بالکل مالک مکان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جونہی دس بجتے ہیں، گائے سینگ بدلتی ہے۔ نظام فلکی میں تبدیلی ہوتی ہے۔ کرسی کا پتلون ایک سپاٹے سے غائب ہو جاتا ہے۔ پائے پر رکھی ہوئی پسینہ دار بھوری ایڑی بھدے زمین پر آن رہتی ہے۔ کپڑوں کی جھٹک پٹک سنائی دیتی ہے۔ گویا فرشتے پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر زمین پر جوتیاں رینگنی شروع ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے پوری باٹا کمپنی کے جوتے تڑپے چل رہے ہیں۔ جوتوں کی کس کس سے آپ کے دانت کبکبا اٹھتے ہیں۔ جیسے ان کے درمیان کوئی ریت کی چٹکیاں چھڑک رہا ہو۔

"ہلو ——— ہلو مس رموالا ہ!" ایک افسردہ غنودگی میں ڈوب جاتی ہے۔ حیرت زدہ کرسیوں پر غیر مرئی صورتیں نظر آنے لگیں گی اور آپ کو پیٹھ پر ٹھنڈی ٹھنڈی انگلیاں رینگتی محسوس ہوں گی۔

ان میں سے ایک صورت تو بالکل تھمے ہوئے طوفان سے مشابہ ہے۔ جیسے بادل امنڈ گھمنڈ کر آئیں اور دنیا کے گنہگاروں سے روٹھ کر وہیں تنے کے تنے رہ جائیں اور اظہار نفرت میں زخمی شیروں کی طرح غرائیں۔ اس شکل کو دیکھ کر آپ کے دل میں بڑے بڑے آتش فشانی پہاڑوں اور خاموش تنوروں کا خیال آجائے گا جہاں پھٹنے سے پہلے لاوا کھولا کرتا ہے اور ہیبت ناک دیو کی طرح ڈکاریں مارتا ہے۔ جیسے کسی جن کو ناحق برابر ڈبیہ میں بند کر دیا ہو۔ آپ کا دل بغاوت پر آمادہ ہوگا۔

دوسری شکل دیکھتے ہی آپ کا دل کسی سے لپٹ کر رو کر دل کی بھڑاس نکالنے کو چاہنے لگے گا۔ آپ کو فوراً یتیم خانوں کی بدانتظامی پر طیش آئے گا۔ اور پھر آپ فلک کج رفتار کو بددعائیں دیں گے۔ غمگین اور دل دکھانے والے واقعات یاد آئیں گے۔ دکھ سکھ امیری، غریبی، بیماری اور تندرستی کا مقابلہ کرنے کو جی چاہے گا۔ اور آپ کا یہ بھی دل چاہے گا کہ دنیا کی ساری بڑی بڑی عمارتیں مسمار ہو جائیں، سڑکیں کھد جائیں، کلب ٹوٹ پڑیں، قہوہ خانوں میں آگ لگ جائے اور سارے خوش پوش لوگ کیچڑ میں پھسل پڑیں، اگر آپ بہت ہی زیادہ رقیق القلب ہیں اور میری طرح غموں کو ہنس ہنس کر برداشت کرنے کے عادی ہیں تو پھر آپ ایک اور شکل دیکھنے کے لئے زندہ رہیں گے۔ چھینک آنے سے پہلے جو آثار ہوتے ہیں وہ اس پر مستقل طور پر چھائے رہتے ہیں۔ آپ سارے وقت یہی محسوس کریں گے کہ اب چھینک آئی اور اب آپ کے اوپر نزع کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہے اس سے نجات ملی۔ مگر توبہ کیجئے! یہ شکل چھینک کر نہ دے گی۔ آپ کے اندر سے لیٹے لیٹے پیٹ میں بائنٹے پڑیں گے اور پھر درد قولنج کا مزہ آنے لگے گا مگر وہ امر چھینک اسی طرح چہرے پر تلی رہے گی۔

اور پھر کبھی کبھی ایک اور شکل بھی آپ کو نظر آئے گی۔ ایک دم سے آپ کو تازہ تازہ انسانی خون کی بو آئے گی۔ اور پھر ایک نیم مقتول شکل نزع کی آخری منزلوں میں آخری

قدم اٹھاتی نظر آئے گی۔ دنیا بھر کے ہولناک قتل اور اقدامِ قتل کے واقعات یاد آجائیں گے۔ اس مقتول و مظلوم صورت سے صاف ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے قاتل کی تلاش میں آئی ہے۔ مشتبہ نظریں پوچھیں گی:۔

"شاید تم نے ہی تو مجھے قتل نہیں کیا ہے"۔ اور آپ کو فوراً سارا قتل کا الزام خود اپنے اوپر جمتا نظر آئے گا۔ آپ کا دل چاہے گا کوئی آپ کو اس کی سزا دے۔ آپ کو عذاب دوزخ کا مزہ چکھائے۔ کیونکہ اتنی دیر میں آپ خود کو قطعی مجرم گرداننے لگیں گے اور آپ کو پولیس کے خوف سے لرزہ آجائے گا۔ مگر آپ فرار نہ ہو سکیں گے۔ آپ اقبال کریں گے۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں یہ زندہ ممی بالکل ایک ملکوتی شے معلوم ہوگی، آنکھیں دیکھ کر آپ کا کلیجہ ہل جائے گا معلوم ہوگا یہ رونے کے تمام پرانے ریکارڈ توڑ چکی ہیں ہیں۔ اور پھر یہ شکل بھی انھیں ہونق کرسیوں پر بیٹھ جائے گی۔ مگر ایسے کہ اگر آپ چھونا چاہیں تو آپ کا ہاتھ خلاء میں لٹکا رہ جائے گا! اوہ معبود!۔

ہاں ایک بات ہوگی، وہ یہ کہ وہ پائے والی ہیبت ناک ایڑی آپ اس صورت کے سر نہیں تھوپ سکتے۔ اب آپ کے دل کی دھڑکن غیر مطمئن ہو جائے گی۔ بلا وجہ آپ کو بے بات کا پچھتاوا شروع ہوگا۔ پھر معلوم ہوگا کمرے میں روحوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اور وہ سب کی سب مل کر زندہ لوگوں کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں۔ غمزہ وہ گیت اور غزلیں یاد آنے لگیں گی ـــــ ہلکا ہلکا المناک نغمہ فضا میں لہرائے گا۔ جیسے قبرستان میں مردوں کے کفن سرسرا رہے ہوں۔ بے رنگ و بو خون کے چھینٹے ہوا میں گھل مل جائیں گے۔ آپ کو اپنے سارے مردہ رشتہ دار اپنے ارد گرد کراہتے، لرزتے محسوس ہوں گے اور بے ساختہ مقدس الفاظ لبوں پر منڈلانے لگیں گے اور پھر آپ سنیں گے"۔ میرے لیے جہان میں ـــــ چین ہے نا ـــــ قرار۔ اوہ دل میں ایک ہوک اٹھے گی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئیں گے۔ نیچے کا ہونٹ لرزے گا ـــــ چہرے

کی باقی ماندہ نسیں مختلف سمتوں میں کھنچنے لگیں گی، گلے میں کونین کی سی گولیاں اٹکیں گی۔ دبی ہوئی سسکیاں ابھرتی محسوس ہوں گی جنھیں دبانے کے لئے آپ کو مجبوراً جھری کے پاس سے ہٹنا ہوگا۔ وہی ننھی سی بے حقیقت جھری جس میں سے اکثر جھانکا کرتی ہوں!

ایک شوہر کی خاطر

اور یہ سب کچھ بس ذرا سی بات پر ہوا۔ مصیبت آتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی۔ پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی کہ ریل میں قدم رکھا کہ اچھی بھلی زندگی مصیبت ہو گئی۔ بات یہ ہوئی کہ اگلے نومبر میں جودھپور سے بمبئی آ رہی تھی۔ سب نے کہا۔ "دیکھو پچھتاؤ گی مت جاؤ"۔ مگر جب چیونٹی کے پر نکلتے ہیں تو موت ہی آتی ہے۔

سفر لمبا اور ریل زیادہ ہلنے والی۔ نیند دور اور ریت کے جھپاکے، اوپر سے تنہائی۔ سارا کا سارا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ جیسے قبرستان میں لمبی لمبی قبریں ہوں۔ دل گھبرانے لگا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے تنگ آ گئی۔ دوسرا لیا اس میں بھی وہی خبریں! دل ٹوٹ گیا۔ کاش میں قبرستان میں ہوتی۔ بلا سے مردے ہی نکل پڑتے۔ نچوں کو دیکھ دیکھ کر جی ہول رہا تھا۔ "کاش کوئی آ جائے — کاش —" میں نے دعا مانگنی شروع کی۔

ایک دم سے ریل جو رکی تو ایک دم سے جیسے ٹیڑیاں ٹوٹ پڑیں۔ انسان تو کم آئے بچے اور پٹلیاں زیادہ، بچے ایسے جو قحط زدہ گاؤں سے آ رہے تھے کہ آتے ہی خوراک پر پل پڑے۔ دودھ پینے والوں کو تو خیر تیار معاملہ مل گیا اور وہ جٹ گئے۔ باقی کے بلبلانے اور تڑپنے لگے۔ پوٹلیاں اس قدر بے ہنگم اور فضول جگہ گھیرنے والی وضع سے بندھی تھیں

کر کسی کل بیٹھتی ہی نہ تھیں۔ ایک سنبھالی تو دوسری تیار۔ میں علیحدہ پٹری پر اس زاویہ سے بیٹھی تھی کہ گٹھری گرے تو میری ریڑھ کی ہڈی بچ جائے۔ مجھے اپنے جسم میں ریڑھ کی ہڈی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کہتے ہیں ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے تو آدمی لوتھڑا ہو جاتا ہے۔

"کہاں جا رہی ہو؟ ——" بے چاری ہم سفر نے گٹھریوں کی طرف سے غیر مطمئن ہوتے ہوئے بھی نہایت فکر مند ہو کر پوچھا۔ میں نے جلدی سے بتایا اور پھر ان کی توجہ اس وزنی گٹھری کی طرف منعطف کی جو شاید برتنوں کی تھی اور ذرا سی ٹھیس سے گرنے کو تیار تھی۔ اگر اتفاقیہ ذرا ہاتھ لگ جاتا تو برتن اس تیزی سے آپس میں ٹکراتے کہ جی گھبرا اٹھتا۔

"کہاں سے آ رہی ہو —— ؟" میں نے ذرا کم مستعدی سے بتایا۔

"میکے جا رہی ہو؟" جب تک شادی نہ ہوئی ہو تب تک جگت میکہ ہی ہے اور کہیں بھی نہیں۔ یعنی میکہ اور سسرال کا سوال ہی نہیں۔ لہٰذا میں چکرائی۔ سوچا اندازاً کس صوبہ میں شادی ہونے کا خطرہ ہے۔

"میاں کے پاس جا رہی ہو؟"

"نہیں!" میں نے چاہا موضوع بدل جاتا تو اچھا ہوتا۔ خواہ مخواہ کون ہمدردی وصول کرے۔

"تو پھر سسرال جا رہی ہوگی —— کیوں؟" ذرا ان سوالوں کے جواب بہت فلسفیانہ ہوتے ہیں۔

"نہیں —— تو —— میں بمبئی جا رہی ہوں —— شادی —— شادی تو نہیں ہوئی۔" میں نے ذرا دل میں حقیر ہو کر کہا۔ حالانکہ شادی کے خلاف کالج کے مباحثہ میں مجھے اول انعام ملا تھا۔ اور اب بھی —— خیر اب تو —— ہاں تو میں نے کہا۔ وہ متحیر ہو کر اتنی زور سے اچھلیں کہ بچے کے منہ سے دودھ چھوٹ گیا۔ اور وہ منہ بوجہ بکری کی طرح چیخا۔

میں نے دھیان ہٹانے کو ان کی توجہ بچے کی طرف کرنا چاہی۔ مگر وہ ٹٹول ٹٹول کر بچے کی ناک میں دودھ ٹھونسنے لگیں اور میں یہاں لکھنا نہیں چاہتی کہ مجھے انھوں نے کس رحم اور مہربانی بھری نظروں سے دیکھا۔ انھیں مجھ پر محبت سی آنے لگی۔ اور میں ڈری کہ کہیں مجھے چمٹا کر رو نہ پڑیں۔ ان کا دل بہلانے کے لئے میں نے چنے والے کو بلایا۔ مگر وہ ایسی ہی اداس رہیں! انھوں نے مجھے دو ایک داؤں پیچ ایک اچھا سا شوہر پھانسنے کے بتائے جو بعد میں تجربہ سے قطعی بیکار ثابت ہوئے۔

میری دعا شاید ضرورت سے زیادہ قبول ہو گئی۔ یا شاید میری خدا کے حضور میں کاتبین کی غلطی سے دوبارہ عرضی پیش ہو گئی۔ کہ ایک فوج انسان کی پھر آئی۔ اس فوج میں بڑے بڑے ریشمی برقعے اور چھتریاں زائد تعداد میں تھیں۔ اور ان کے ساتھ گنے بھی تھے جن کے ٹکڑے ناپ ناپ کر اتنے بڑے کاٹے گئے تھے کہ ریل کے کسی کونے میں ٹھیک سے نہ رکھے جا سکیں ان کے بستر اور صندوق بھی کچھ ایسے تھے جو کسی پٹری کے اوپر یا نیچے کسی انداز سے بھی نہ رکھے جا سکتے تھے۔ ان بیویوں نے آتے ہی ریل میں ہلاچلی مچا دی۔ صندوق اور پلندے گھسیٹ کر تباہ کر دیئے۔ پہلے والی مسافرہ کی ضدی پوٹلیاں جو شاید تاک میں تھیں بچوں اور عورتوں پر گریں اور وہ سب ایک دوسرے پر گرے۔

"کہاں جا رہی ہو؟" یہ بھی کچھ پریشان تھیں۔

بتایا۔

"کہاں سے آ رہی ہو ــــ ؟" بولیں۔ حالانکہ ابھی ٹھیک سے جمی بھی نہ تھیں۔ برقع پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر بتایا۔

"میکے جا رہی ہو یا سسرال ؟" کاش مجھے معلوم ہوتا۔ مگر چکنے کا موقع نہ تھا۔ سسرال! ایسے کہا کہ وہ ہم سفر جو پہلے جرح کر چکی تھیں، نہ سن پائیں۔

"کیا کرتے ہیں میاں ؟" اب میں نے سوچا کچھ تو کرتے ہی ہوں گے بیکار تو کاہے کو

پھرتے ہوں گے۔ مگر کاش وہ مجھے یہ بھی بتا دیتے تو اچھا ہی تھا۔ بہرحال نکھٹو تو نہ ہوں گے۔ پر ـــــ وہ خود ہی بولیں:۔

"ریلوے میں ہیں ـــــ"

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ" میں نے پُر شوق لہجے سے انھیں یقین دلایا۔ یہ ٹھیک رہا۔ میں نے سوچا۔ ریلوے کا آدمی خوب رہے گا۔ مزے سے مفت کے ٹکٹ تو ملیں گے، ہندوستان بھر میں گھوم لو۔ اور مجھے وردی بھی ان کمبختوں کی پسند ہے۔ خصوصاً وہ ٹوپی اور سیٹی لال ہری جھنڈی۔ اچھا ہی ہوا جو یہ بے چاری مل گئیں۔ ورنہ اپنے کو تو کبھی گارڈ، بابو وغیرہ کا خیال بھی نہیں آیا ـــــ اے ہاں سچ تو ہے۔

"کون کام پہ ہیں ـــــ وہ ریل میں ؟"

"کسی ٹھیک ہی کام پر ہوں گے ـــــ اور کیا۔" مجھے خیال ہی نہ آیا کہ گارڈ بابو کی بیوی بننا آسان ہے مگر یہ تفصیل تو ذرا بھاری خوراک ہے۔

"پھر بھی ـــــ کیا کام کرتے ہیں ؟ ریل میں تو ہزار سے زیادہ کام ہیں۔"

"اے .... سیٹی ـــــ قلی ـــــ" میں ایسی بولائی کہ کچھ بن نہ پڑا۔ سامنے ایک قلی بڑا سا بنڈل، ایک بستر، آدھی درجن صراحیوں کی سیڑھی اور دو لوٹے لیے چلا آرہا تھا اور ایسا بن رہا تھا جیسے بہت بھاری ہیں۔

"قلی ـــــ تمھارا میاں قلی ہے ـــــ" حیرت کا ایک دورہ ان پر بھی پڑا۔ میں چاہتی تھی کہ ذرا ہم آہستہ آہستہ گفتگو کریں ورنہ کہیں پہلی ہمسفر سن نہ لیں۔ ان کا بچہ سکون سے دودھ پی رہا تھا۔ مگر ایک دفعہ بات منہ سے نکل جائے تو میں بھی اس پر ہی جم جاتی ہوں اور یہاں تو جتنے کے ویسے ہی لالے پڑے تھے۔

"ہاں ـــــ آں قلی ہی سہی پھر تمھیں کیا ؟" میں نے ذرا برا مان کر کہا۔

"تمھارا میں .... میاں قلی ـــــ"

"ہاں پھر ـــــ تم کیوں جلو ـــــ تمھارا جی چاہے بہن تم بھی تلی سے کر لو ـــــ دس تلیوں سے کر لو کون روکتا ہے۔ اتنے سستے ہیں تلی"۔ مگر میں ذرا چپ رہی اور مظلوم سی صورت بنا لی۔

بولیں۔"کیسے تمھاری شادی تلی سے ہ؟"۔ اور سوچنے لگی تلیوں سے کس طرح شادیاں ہوتی ہیں۔ میں نے چاہا دل سے کچھ گڑھوں کسی تلی کی شادی کا حال، مگر وہ اس قدر غیر دلچسپ معلوم ہوا۔ پھر میں نے کہا :-

"ایک تلی تھا ـــ"

انھوں نے توجہ سے سنا۔

"وہ رہا کرتا تھا ـــــ" میں چاہتی تھی وہ میری ہر بات پر "ہوں" کریں یا کم از کم سر ہلائیں۔

"پھر کیا ہوا کہ ایک دن ـــــ کہ ـــــ" کاش مجھے معلوم ہوتا۔ اس وقت کوئی قصہ بھی تو نہ یاد آیا۔

"وہ لے جا رہا تھا سامان ـــــ" میں نے چاہا وہ پوچھیں "کس کا" اور انھوں نے پوچھا۔

"ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کا ـــــ پھر وہ لڑکی ـــــ وہ لڑکی عاشق ہو گئی ـــــ"

"کون لڑکی یہ تو معلوم ہی نہیں پڑا۔ خیر کیا مضائقہ ہے۔ کوئی بات نہیں ـــــ یقیناً ہو گی ہی کوئی لڑکی۔ کوئی خوبصورت سی لڑکی ہو گی۔

"تو وہ تلی پہ کیوں عاشق ہو گی ـــــ ہ؟"

"وہ عاشق یوں ہو گئی کہ ـــــ کہ ـــــ ارے بھئی اب یہ کیا معلوم کوئی تو وجہ ہے ہی عاشق ہونے کی۔ وہ مسکرایا ہو گا اسے دیکھ کر ـــــ" اتنے میں ایک نہایت بھیانک

قسم کا بابو مجھے دیکھ کر مسکرایا اور میں ڈری کہ کہیں سچ مچ عاشق نہ ہونا پڑے۔ ابھی انٹرویو میں جانا ہے۔ سنتے ہیں کہ عشق میں بڑی خراب حالت ہو جاتی ہے۔ بھلا پردیس میں کہاں عاشق ہوتی پھروں گی۔ ویسے ہی جسیم بھائی کے یہاں جانا ہے۔ اور وہ ہیضہ کے بعد بس عشق سے گھبراتے ہیں۔ خیر بات گئی گذری ہو گئی۔

"اے بہن! یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ـــــ کون لڑکی، کس کا عشق۔ میں کہتی ہوں تمھاری شادی کیسے ہوئی ـــــ؟"

"ہاں ـــــ ان کی بچاری کی شادی نہیں ہوئی" آخر کو پہلی مسافرہ کو پتہ چل ہی گیا نا۔ کتنا مری سے کہا آہستہ بول آہستہ مگر ـــــ یہ لیجئے وہ تلی بھی ہاتھ سے گیا۔

"جب نہیں ہوئی تھی ـــــ" میں نے چاہا شاید مان جائیں۔

"اوئی ـــــ تو کیا ریل میں بیٹھے بیٹھے ہو گئی" کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش گرم گرم چائے کے بجائے لوگ امیر امیر کماؤ شوہر بیچتے ہوتے۔ تو سفر کے لئے تو میں ضرور لے لیتی۔ پھر چاہے ـــــ پھر دیکھا جاتا۔ اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اب کے ایک مناسب قسم کا میاں ڈھونڈنا چاہئے۔ ایسا اس میں کیا ٹوٹا ہے اپنا ـــــ ٹھیک ہی رہے گا۔ بلا سے ہر مسافر سے نئے نئے جھوٹ تو نہ بولنے پڑیں گے کہ جب کسی نے پوچھا فوراً میاں حاضر۔

"ارے، بھئی اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں" وہ میرے مستقبل سے نا امید ہو کر بولیں۔

"موٹر مانگتے ہیں۔ گاڑی گھوڑا دو ـــــ اور کبھی کماؤ ہوں جبھی نا ـــــ ایسے ملے جاتے ہیں کماؤ لڑکے"۔

میں رنجیدہ ہو گئی۔ آخر یہ لڑکے کماؤ کیوں نہیں ہوتے ـــــ کمبخت اچھے لڑکے پہلے ہی زمانے میں کتنے ہوتے تھے۔ مولی گاجر کی طرح۔ پر اب چاہو کہ آنکھ میں لگانے کے لئے اچھا لڑکا مل جائے تو نہیں۔ اس لڑائی نے تو اور اجاڑ کر رکھ دیا۔ چلو بھئی پہلے لڑکے تو تھے کماؤ تھے یا نکھٹو۔ پر اب تو جسے دیکھو لڑائی پر چلا جا رہا ہے۔ لو صاحب یہاں تو بیویاں

طعنے دے رہی ہیں اور لڑکے ہیں کہ مرنے کٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔

"تم پھر شادی کیوں نہیں کر لیتیں ـــــ" ایک بولیں۔

"جیسے آپ کی مرضی"۔ میں نے اس معصوم لڑکی کی طرح کہا جس سے والدین شادی طے کرنے کے بعد روشن خیال بننے کے لئے رائے لیتے ہیں"۔

"کب کرو گی پھر اب نہیں کرو گی تو؟"

"اب ـــ یعنی ابھی ـــ میرے خیال میں ـــ تو ـــ اگر جنکشن تک ٹھر جاتے تو اچھا تھا ـــ"

"کب؟"

"یہی کہ ـــ جب آپ کی مرضی ہے تو پھر کیوں اس نیک کام میں دیر کی جائے"۔

"کیسا نیک کام؟ کیا کہہ رہی ہے لڑکی؟"۔ بہت ہی گھبرا گئیں۔

"میں نے پوچھا بھئی شادی کیوں نہیں کرتیں تم ـــ" دوسری بولیں۔

"تم کیوں نہیں کرتیں شادی ـــ بس؟" میں اب کافی جل اٹھی تھی۔ حالانکہ ان کا بچہ مسلسل دودھ پی رہا تھا۔ مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

"ادئی ـــ معلوم ہوتا ہے کچھ دماغ بھی خراب ہے ـــ" وہ بچہ کو اور واضح طور پر لائیں تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ صرف گود میں سو رہا ہے۔

"تو ـــ اچھا تو تمہاری شادی ہو گئی ـــ کب کی تم نے شادی ـــ" میں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"ہمارے ماں باپ نے کی ہماری شادی، ہم خود کیوں کرتے ـــ"

"تو آپ شادی کے خلاف ہیں ـــ ٹھیک ہے ـــ بالکل ٹھیک۔ میرے بھی ماں باپ نے شادی کی ـــ جاہل انسان!"۔ اس کے بعد وہ کچھ مکدر سی ہو گئیں اور غمگین ہو کر ناشتہ دان میں امرتیاں نکال کر غم غلط کرنے لگیں۔

اے خدا! تو جب دعائیں قبول کرنے پر آتا ہے تو یوں دعا قبول کرتا ہے؟ تیرے بندوں کو کسی کل چین نہیں۔ یہ تیری ناچیز بندی تنہا تھی۔ اس نے دوسرا ہٹ چاہی تو تو نے یوں عذاب کی طرح مسافر نازل کرنا شروع کئے! اور مسافروں سے زیادہ اسباب، ویسے بھئی ہمیں کیا حق کہ بے بات تیری مصلحت میں دخیل ہوں مگر پروردگار اتنا تو سوچا ہوتا کہ انسان میں تو نے جتنی برداشت دی ہے اتنا ہی بوجھ لاد۔ کہتے ہیں ہم تو بس!۔

اور میں دل میں ڈری کہ اگر دعاؤں کے قبول ہونے کا یہی ڈھنگ رہا تو کہیں وہ شوہر کے لئے جو ابھی ابھی دعا مانگی تھی اس کا بھی کچھ ایسا ہی قصہ نہ ہو جائے اور لے چلا چل ایک پہ ایک! میرا تو دم ٹوٹ جائے گا! میں ایک کے ہی قمیص میں بٹن لگا دوں اور چائے بنا دوں تو بہت جانو۔ مجھ سے بھلا اتنے کاہے کو جھیلے جائیں گے۔ سست مٹی ویسے ہی ہوں۔ اب اتنے میاؤں کو کون میرے بیٹھ کے بھگتے گا۔ کہتے ہیں کہ ڈاک خانہ میں اگر بھولے سے کوئی غلط خط پڑ جائے تو تھوڑی سی رشوت دے کر واپس لے سکتے ہیں۔ کاش دعاؤں کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی انتظام ہوتا۔ مگر دعا ایک دفعہ مانگی جا چکی تھی اور پے در پے قبول ہو رہی تھی۔

نئے ہمسفر بہت ہی خلیق معلوم ہوتی تھیں اور ضرورت سے زیادہ رقیق القلب، کچھ نازک سی شاعرانہ بیماری۔ کچھ آہستہ بولنے کی عادی۔ مجھے ان پر بے بات پیار آنے لگا۔

"حیدرآباد جا رہی آپ ——" انھوں نے بڑے وثوق سے پوچھا۔ میں ڈری کہ انکار کروں گی تو خفا ہو جائیں گی۔ لہٰذا بڑی عاجزی سے انکار کیا اور بتایا کہ بمبئی جا رہی ہوں۔

"احمد آباد سے آئی ہوں گی ——" کس ہوشیاری سے وہ پرانی بوتلوں میں نئی دوا بھر بھر کر سر سہلا سہلا کر پلا رہی تھیں۔ مگر ان کا چہرہ اس قدر رویا ہوا تھا کہ دل دکھانے کی ہمت نہ پڑی۔ میں نے بتایا۔

"پڑھتی ہیں وہاں ——"

"جی نہیں، انٹرویو کے لئے جا رہی ہوں ——"

"میرے ایک چچا کے سالے کی خالہ بھی بمبئی میں رہتی ہیں —— ان سے ملئے گا ——"

میں نے وعدہ کر لیا۔ بھلا میں کہاں ان کے چچا کے سالے کی خالاؤں کو ڈھونڈتی پھرتی ——!

"وہاں آپ کے والد والدہ ہیں ——"

"نہیں —— میرے ....." بولنے ہی نہ دیا خود بولیں۔

"اچھا آپ کے شوہر ہوں گے!" گعن! وہ دیکھئے گھما پھرا کر وہی ایک ٹانگ مرغی کی۔ شوہر۔ شوہر۔ ہندوستان کے شوہر اس قدر مر گھنے۔ ناکیں کاٹ لیں طلاقیں دے دیں، بڑی مشکل سے ملیں، اور ملیں تو نکھٹو! رنڈی بازی کریں، جوا کھیلیں۔ مگر بیویاں ہیں کہ واری جا رہی ہیں۔ جسے دیکھئے اپنے یا پرائے شوہر کا رونا رو رہی ہے۔ کنواریاں ہیں تو شوہر کے گیت گا رہی ہیں، بیاہیاں ہیں تو پریتم پر فدا۔ اور یہ پریتم کتے خون تھکوائے دے رہے ہیں۔ ان مظالم معشوقانہ پر تو یہ حال ہے اگر ذرا لاڈ کر لیتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں نے سوچا میاؤں کے ظلم میں بھی کچھ مصلحت ہے۔

"کہاں رہتی ہیں آپ بمبئی میں —— کتنے بچے ہیں آپ کے ——" میں تو سوچ میں پڑی تھی اور وہ میاں کے بعد بچوں کی تعداد پر اتر آئیں۔

"آٹھ ——" میں نے پلیٹ فارم پر کتے گنتے ہوئے کہا۔ دریوں کے ساتھ مسافر سے زیادہ کتے کہاں سے آتے ہیں!۔

"ہاں —— کیوں، آپ کیوں برا مانتی ہیں؟ یقین نہ آئے تو گر گن لیجئے۔"

"اب میں راستہ میں کیسے اتروں —— ہاں انشاءاللہ کبھی آنا ہوا میرے چچا کے سالے کی خالہ کے یہاں تو —— خیر —— مگر بہن! معلوم تو نہیں ہوتا منہ سے ——"

"منھ سے معلوم ہی کیا ہوتا ہے؟" میں نے فلسفیوں کے انداز میں کہا۔ جب دنیا سے مجھے نفرت ہونے لگتی ہے اور ہر چیز نیم مردہ اور اداس لگنے لگتی ہے تو میرے دماغ میں فلسفہ بھرنے لگتا ہے۔

"شادی کو کتنے برس ہوئے ــــ" انھوں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"چار برس تین مہینے اور ــــ"

"اور آٹھ بچے؟ ــــ اے بہن میں سمجھی تھی چلو ہوں گے ــــ مگر"۔

وہ بہت غم زدہ سی ہوگئیں۔ مجھے رحم آگیا۔ مگر میں نے تہیہ کرلیا کہ کچھ ہوجائے اب اور نہیں دبوں گی۔ ورنہ بچے کے بعد یہ نواسے پوتے بھی میرے سر منڈھ دیں گی اور وہ بیویاں جو میرے حالِ زار سے واقف ہیں اونگھ نہ سکیں پھر خواہ مخواہ کی لے دے پڑے گی۔ آٹھ بچوں سے ویسے ہی روح قبض ہوئی جا رہی تھی۔

"ہاں ہاں کہتی تو ہوں ــــ آٹھ ــــ"

"ماشاء اللہ سب زندہ ہیں ــــ مگر بہن یہ ہوئے کیسے؟"

"کیسے ہوتے۔ جیسے دنیا جہان میں ہوتے ہیں ویسے ہی ہوئے ہوں گے"۔

"میرا مطلب ہے ــــ چار سال میں ــــ"

"ہاں میں سمجھی ــــ اچھا یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں آپ تو ــــ یہ ہوا کہ کبھی دو، کبھی تین ــــ اور ــــ"

"ہے ہے" وہ لرزیں، اور مجھے برا لگا کہ آخر یہ کون ہوتی ہیں برا ماننے والی، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آخر انھیں کیا۔ چاہے کوئی ایک بچہ دے چاہے دس۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ پچھلی ملاقاتی جاگ اٹھیں۔

"سنا بہن! ان کے دو دو تین تین ساتھ ہوئے ــــ بچے"۔ انھوں نے شکایت کی اور وہ گھبرا کر اپنے بچے گننے لگیں۔ کیوں کہ سوائے بچوں کے انھوں نے کچھ نہیں سنا۔

"کیا قصہ ہے؟" دوسری بولیں۔ جب معاملہ خوب سمجھا دیا گیا تو تینوں بگڑ کھڑی ہوئیں۔

"ابھی کہتی تھیں شادی نہیں ہوئی اور ابھی دو دو تین تین بچے ہونے لگے"۔ ایک نے ڈانٹا۔

"میری کیوں نہ ہوتی شادی خدا نہ کرے۔ تمھاری ہی نہیں ہوئی ہوگی ــــ"

بات بگڑنے لگی۔ پاس سے ایک ٹکٹ چیکر گذرے۔ یا جانے کون تھے۔ مجھے تو ہر ریل کا نوکر ٹکٹ چیکر ہی لگتا ہے۔ میں نے جھک کر ان سے وقت پوچھا۔ وہ بتانے کے بعد مسکرانے لگے اور مسکراتے ہوئے چل دیئے۔

"تم تو کہتی تھیں اکیلی جا رہی ہوں؟ ــــ اور یہ تمھارے ــــ"

"یہ میرا نواسہ ہے ــــ" قبل اس کے کہ وہ کوئی رونگٹا سا رشتہ قایم کریں میں نے خود ہی اپنے لیے فیصلہ کر لیا۔

"نواسہ؟" تینوں چیخیں!۔

اللہ! یہ آج ان لوگوں کو مجھ سے کہاں کا بیر پڑ گیا تھا کہ میرے کنبے کے ہر فرد کے ذکر پر بن بن کر چونک رہی تھیں۔

"کیا کہتی ہے لڑکی ــــ یہ تیرا نواسہ کہ ــــ"

"تو آپ کو کیا؟"

"بہن! بال تو سفید رکھے تھے ان کے ــــ" دوسری بولیں

"نزلے سے ہو گئے ہوں گے"۔ میں بڑبڑائی۔

اور پھر میں بالکل کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ خودکشی کو دل نہ چاہا۔ چلتی ریل سے اترنے کی پریکٹس نہ کی۔ زمین سخت اور آسمان دور۔

ہونہار بات ہو کر رہتی ہے۔ جب زائد سامان تلوا کر بلٹی دینے لگا تو کلرک نے
کہا۔"آپ کا نام ـــــ شوہر کا نام ـــــ؟"
"چغد!" میں نے دانت پیس کر کہا۔
"چوکھے! ـــــ کیا اونڈا نام ہے ـــــ!" اس نے متعجب ہو کر کلرک کے
کہنی ماری۔
یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ جب اس نے مجھے مسز چوکھے بنا کر رسید دی
تو میں نے اس کے منہ پر اپنا بٹوہ مع ایک عدد موٹی کتاب کے کھینچ مارا اور یہ سب کچھ ہوا
بس ایک شوہر کے خاطر۔

عورت اور مرد

افراد ڈرامہ

زبیدہ ـــــ پڑھی لکھی، مگر فرمانبردار اور ڈرپوک لڑکی
رشید ـــــ زبیدہ کا شیدائی
محمود ـــــ رشید کا بچپن کا دوست
جج صاحب پنشن یافتہ رئیس، زبیدہ کے والد، سر کے خطاب سے سرفراز
بیگم ـــــ ان کی بیوی
نیاز ـــــ جج صاحب کے چھوٹے بھائی

○

[زبیدہ غمگین بیٹھی جوگیا کا خیال گنگنا رہی ہے۔ کوئی آتا ہے۔]

زبیدہ : (چونک کر) کون ؟ ـــ اوہ ـــ رشید۔

رشید: ہاں ــــ زبیدہ ــــ تم نے منع کیا تھا مگر ــــ مگر

زبیدہ: ہاں رشید میں سمجھتی ہوں۔ تم: (خاموشی)

رشید: زبیدہ میری زندگی تباہ ہو جائے گی ــــ تم جانتی ہو میں تمھارے بغیر نہیں جی سکتا۔

زبیدہ: مگر رشید ــــ ابا جان ــــ آہ ابا جان کو ہمارے احساسات کی کیا پروا۔ ان کی بلا سے۔ میں ہنس کر زندگی گذاروں یا رو کر ــــ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ بس ان کی بیٹی سونے چاندی میں لدی رہے اور اس کے دروازے پر ہاتھی جھولیں۔ یہ نہیں سوچتے یہ بے رحم بزرگ، یہ طاقتور لوگ کہ زندگی کے لئے نہ سونے چاندی کی ضرورت ہے اور نہ ہاتھیوں کی۔

رشید: جب تم یہ سوچتی ہو تو پھر ــــ زبیدہ ــــ

زبیدہ: رشید میرے سوچنے اور نہ سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں ابا جان کو دکھ نہیں پہنچا سکتی۔ مجھ میں انھیں دکھی دیکھنے کی ہمت نہیں۔ رشید میرا خیال دل سے نکال دو۔

رشید: یہ کیسے ہو سکتا ہے زبیدہ۔ میں ہزار چاہوں تب بھی تمھارے خیال کو دل سے نہیں نکال سکتا، یہ کبھی نہ ہوگا مجھ سے۔

زبیدہ: رشید! مگر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔

رشید: تم ــــ تم میرے ساتھ چلو۔ ہم شادی کر لیں۔

زبیدہ: (خوف زدہ ہو کر) کیا، تمھارے ساتھ بھاگ چلوں اور دنیا ــــ "

رشید: میرا مطلب ــــ میرا مطلب یہ نہیں ــــ اور زبیدہ ذرا سوچو میں تمھارے بغیر ــــ اوہ ــــ (پژمردہ ہو جاتا ہے۔)

زبیدہ: مگر یہ تم نے کیسے سمجھا کہ میں تمھارے ساتھ بھاگ نکلوں گی؟ رشید تمھیں میرے

متعلق ایسا خیال کیسے آیا؟ میرے متعلق؟

رشید : معاف کرو زبیدہ معاف کردو۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔

زبیدہ : تم جانتے ہو ابا جان کا کیا حال ہوگا۔ دنیا انھیں کیسے جینے دے گی۔ کیا کہیں گے لوگ۔ سر ہدایت علی کی لڑکی بھاگ گئی؟ اوہ رشید ___ سوچو تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم رشید؟___

رشید : مگر زبیدہ میری طرف دیکھو۔ میرے دل کی طرف دیکھو___

زبیدہ : رشید میں جانتی ہوں سب کچھ جانتی ہوں ___ بس میری بات مانو مجھے بھول جاؤ۔ خدا تمھیں دنیا میں خوشیاں دکھائے۔ تمھاری مسرتوں کو دیکھ کر میں بھی خوش ہولوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو: (رقت)

رشید : اوہ زبیدہ ___

زبیدہ : تم رو رہے ہو رشید۔ میرے دکھے ہوئے دل کو اور دکھا رہے ہو؟ مگر خیر تمھیں کیا۔ جب میرے ماں باپ ہی میری خوشی اور ناخوشی کو نہیں پہچانتے تو پھر تم ___

رشید : زبیدہ تم جو کچھ کہو میں تیار ہوں۔

زبیدہ : مجھے بھول جاؤ ___ سنا تم نے ___؟

رشید : یہ نہیں ہو سکتا ___ (جوش سے) زبیدہ میں تمھیں نہیں بھول سکتا ___ میں ___ میں ___ تم میرے دل میں اسی طرح روشن ستارے کی مانند چمکا کروگی۔ میں تمھارے بغیر نہیں جی سکتا۔ زبیدہ ___ کیا میرے لئے کوئی راستہ نہیں؟

زبیدہ : ذرا سوچو ابا جان کی پوزیشن۔ وہ اس سال الیکشن کے لئے کھڑے ہو رہے ہیں۔ رشید! ہمارے اور تمھارے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ بھول جاؤ

مجھے ہے"

رشید : یہ نہیں ہونے کا ـــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری زندگی تمھارے بغیر بیکار ہے۔ میں ـــــ"

زبیدہ : رشید! ـــــ کوئی ایسی ویسی بات نہ کر لینا ـــــ دیکھو۔ میری خاطر۔ تمھاری ہر بات میرے لئے زہر قاتل ہو جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ساری دنیا میں یہ بات اڑ جائے گی کہ سر ہدایت علی کی لڑکی کی خاطر رشید نے جان دی ـــــ ابا جان کیا کہیں گے۔ دنیا کیا کہے گی۔ تمھیں جینا ہوگا ـــــ

رشید : کیا یہ حکم ہے ـــــ زبیدہ۔

زبیدہ : نہیں ـــــ التجا!

رشید : اچھا ـــــ اچھا زبیدہ! میں زندہ رہوں گا۔ اس منحوس زندگی کو کسی نہ کسی طرح گزاروں گا۔ اور تم ایک دیوی کی طرح میرے دل میں بسی رہو گی۔ زبیدہ مجھے اس خاموش پرستش کی تو اجازت دو۔ بس ـــــ اوہ ـــــ

زبیدہ : رشید ـــــ تم میرے دل میں ایک مقدس یاد بن کر رہو گے۔ جاؤ رشید۔ اب جاؤ۔ خدا تمھیں سکھ دے۔

[رشید جاتا ہے۔ دو چار آہوں اور سسکیوں کے بعد رشید بھاری قدموں سے چلا جاتا ہے۔ راستہ میں ایک آدمی کی غمگین راگنی سے خود بخود متاثر ہو کر بڑبڑاتا ہے۔]

رشید : یہ دنیا ـــــ یہ ناپاک سوسائٹی ـــــ اوہ : (محمود سے ٹکر ہو جاتی ہے۔)

محمود : میرے یار دیکھ کر نہیں چلتے۔ کیا بات ہے۔

رشید : کچھ نہیں محمود۔

محمود : کچھ تو ـــــ بسور کیوں رہے ـــــ اماں نے مارا ہے۔

رشید : خدا کے لئے مذاق کے لئے موقع اور محل تو دیکھا کرو۔ کہ بس ــــ

محمود : اوہو ہو ــــ یار بھول ہوئی ــــ اچھا۔ لیلیٰ کے کوچہ سے طواف کر کے آ رہے ہو۔ کہو کیا حال ہیں ؟

رشید : جاؤ محمود اپنا راستہ لو۔ مجھے کیوں چھیڑتے ہو ؟

محمود : کچھ بولو بھی ہوا کیا ــــ کیا بات ہوئی ــــ سنا ہے وہ بڈھا بڑا اکڑتا ہے ــــ میں تو پہلے ہی کہتا ہوں کہ چھوکری کو لے کر چل دو۔ پھر ہوتا رہے گا کچھ ــــ

رشید : تم نے زبیدہ کو نہیں پہچانا۔ وہ جان دے دے گی ، مگر ــــ

محمود : مگر کیا ؟

رشید : وہ میرے ساتھ کسی طرح بھاگنے پر راضی نہ ہوگی۔

محمود : یار میرے بھاگنے کو کون کہتا ہے۔ مزے سے سہج سہج چل دو۔ ٹیکسی لو اور اڑ جاؤ۔

رشید : پھر تمہاری بد مذاقی ہوئی شروع ــــ اور خاندان کی ناک ــــ

محمود : چولہے میں ڈالو ناک اور کان ــــ ناک نہ ہوئی روئی کا پھویا ہو گئی کہ بات بات پر اڑی جاتی ہے اور سچ کہتا ہوں بڈھے کی ناک سے لمبی تو دلی بھر میں نہ ملے گی ــــ لڑائی کی گڑبڑ میں دنیا بھاگ رہی ہے۔ تم بھی چل دو۔

رشید : للہ بس کرو۔ کچھ دل کو تسلی دینے سے رہے۔ الٹی نمک پاشی کر رہے ہو۔

محمود : تو پھر خودکشی کر لو ــــ اور کیا۔

رشید : اور زبیدہ کو بدنام کر دوں ؟ ــــ خوب ؟

محمود : خوب رہی۔ شادی کرو گے نہیں اور خودکشی ــــ وہ کرنے نہیں دیتیں۔

رشید : بھئی محمود! اب جاؤ نا تم۔ کیوں سر کھپا رہے ہو، اپنا۔

محمود : اچھا بھئی غصہ کیوں ہوتے ہو ــــــ لو بھئی کچھ نہیں کہتے۔ بس۔ تم رشید پروا نہ کرو۔ یار تمھارے لیے وہ بانکی چھوکری لائیں کہ زبیدہ بھی اس کے سامنے پانی بھرنے لگے۔ کیوں۔ لو ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔

رشید : میں عمر بھر شادی نہیں کروں گا۔

محمود : یا اللہ۔ ارے بھائی ــــ تو ــــ تو ــــ سدا کنوارے رہو گے؟"

رشید : محمود! واللہ انسان نہیں پتھر ہو تم ــــ اگر تمھارے اوپر ایسا وقت پڑتا تو میں کبھی بھی تمھارا مذاق نہ اڑاتا۔

محمود : مذاق کون گدھا اڑا رہا ہے۔ اول تو ہم بے چارے اتنے خوش نصیب کہاں کہ ہمارے محبوب ہمارے جوتیاں ماریں ــــ اور ہم ارے ارے ــــ تم تو آج بات بات پر بھنائے جاتے ہو۔ ایک بات تو سنو۔

رشید : کیا؟۔

محمود : تم کہو تو میں زبیدہ کے پاس جاؤں اور اس سے کہوں۔

رشید : بے کار ہے۔ سب بیکار ہے۔ وہ مجبور ہے۔

محمود : مجبور وجبور کچھ نہیں ــــ بنتی ہے کمبخت۔

رشید : محمود!

محمود : ارے یار! تم تو آج زبان کترنے پر تلے ہو۔ واہ کیا سمجھا ہے تم نے مجھے۔ تمھارے ہی بھلے کو کہتا ہوں کہ اس کے پاس جاؤں۔ اور ــــ

رشید : اور ــــ کیا ــــ ؟۔

محمود : اور کہوں کہ تمھیں اپنی غلامی میں لے لے۔ ہاں اور کیا کہوں یہی ــــ کہ تم بھی نرے الو ہو۔

رشید : تم چاہو تو جاکر آزمالو۔ مگر میں کہہ چکا ہوں کہ وہ غریب بھی مجبور ہے۔

محمود : تم دیکھتے ہو۔ وہ جاکر الو پیرا ہو کہ بس۔ نہ تمھارے ساتھ بھگوا دوں تو محمود نام نہیں بھنگی۔ کیا سمجھے!

رشید : یہ بھاگنا بھاگنا کیا لگا رکھا ہے۔ وہ بھی کیا کوئی آوارہ لڑکی ہے کہ تم کہوگے اور وہ بھاگ کھڑی ہوگی ؟

محمود : کہاں ملے گی وہ اس وقت ؟

رشید : پارک میں۔ روز شام کو وہیں جاتی ہے۔

محمود : اچھا تو میں کوشش کرتا ہوں ———

وقفہ

[پارک میں آدمیوں کی چہل پہل اور بینڈ کی آوازیں۔ زبیدہ ملتی ہے۔]

محمود : اوہ ——— مس زبیدہ ——— ذرا ——— آداب عرض ——— میں ——— آپ مجھے پہچانتی نہیں شاید ——— میں نے آپ کو ———

زبیدہ : جی میں نے آپ کو کالج کے جلسہ میں کئی بار دیکھا ہے۔

محمود : میں رشید کا دوست ہوں۔ یہاں بینڈ بہت زور سے بج رہا ہے آپ کو تکلیف نہ ہو تو ذرا اس طرف چلیں ———

زبیدہ : (چل کر) : کیسے کچھ کہنا ہے آپ کو ———

محمود : جی ——— وہ ——— میں رشید کا دوست ہوں۔ یہ کہنا تھا آپ سے کہ وہ جو آپ کے والد صاحب نے کیا وہ تو ذرا سخت سا معلوم ہوتا ہے۔

زبیدہ : ہوں۔

محمود : آپ جانتی ہیں۔ رشید ایک بودا انسان ہے۔ بیچارا ہمیشہ کا جذباتی، دکھی،

اور پریشان۔

زبیدہ : جی۔

محمود : وہ جب سے اوندھا پڑا ہے بے چارہ۔

زبیدہ : پھر میں کیا کر سکتی ہوں۔

محمود : آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ یعنی سب کچھ آپ ہی کر سکتی ہیں۔ کیوں اس کی زندگی بگاڑتی ہیں۔

زبیدہ : لیکن آپ کو اس سے مطلب ؟

محمود مطلب ـــ لیجئے بہت کچھ۔ وہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ دوسرے ـــ

زبیدہ : ہاں دوسرے ـــ

محمود : دوسرے یہ کہ ـــ وہ ـــ وہ آپ تو جانتی ہی ہیں عشق میں انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

زبیدہ : مسٹر محمود !

محمود : جی جی۔ معاف کیجئے گا ـــ کیا ؟۔

زبیدہ : آپ کا طرز گفتگو ـــ معاف کیجئے گا نہایت عامیانہ ہے۔

محمود : اوہ۔ جی ہاں۔ مگر میرے طرز گفتگو پر نہ جائیے۔ میرے جذبات پر غور کیجئے۔ ذرا سوچئے وہ میرے کمرے میں رہتا ہے۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے۔ نیند میں بڑاتا ہے۔ لازمی طور پر مجھے بھی اس کے ساتھ پریشان ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہاں تک دوستی ہے کہ ـــ

زبیدہ : کیا مطلب آپ کا ـــ

محمود : یہ کہ پہلے تو اسے پھانس لیا آپ نے اور پھر ـــ

زبیدہ : مسٹر محمود (چلنے لگتی ہے) میں آپ کی بکواس سننے نہیں آئی۔

محمود : ارے تو میں نے کہا ہی کیا ــــــ ارے سنیئے تو۔ بس دو باتیں۔
زبیدہ : بس بس۔ میرے ساتھ نہ آئیے۔ لوگ آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر کیا کہیں گے۔
محمود : کیا کہیں گے۔ لاحول ولاقوۃ۔ کوئی میں آپ سے عشق لڑا رہا ہوں۔ واہ جی واہ۔
زبیدہ : آپ بڑے بیہودہ ہیں۔
محمود : جی بجا۔ ہوں گا بیہودہ، مگر میرا مطلب ہے آپ ذرا اطمینان سے میری بات سن لیجئے۔ نہ جانے لوگ میری باتوں سے کیوں بگڑنے لگتے ہیں۔ آپ کے رشید ــــ
زبیدہ : محمود صاحب ــــــ تشریف لے جائیے۔ آپ کی زبان قابو میں نہیں ہے۔
محمود : ارے توبہ! اچھا صاحب سنیئے۔ اگر آپ اس سے شادی نہ کریں گی تو مر جائے گا کمبخت، افیونی ہے منحوس کہیں کا۔
زبیدہ : میں مجبور ہوں ــــــ میرے والد صاحب .....
محمود : ارے چھوڑیئے صاحب۔ اب آپ جوان ہیں۔ آپ سمجھ دار ہیں۔ اپنی اونچ نیچ خود دیکھ سکتی ہیں۔
زبیدہ : مگر ان کی پوزیشن ؟
محمود : ان کی پوزیشن بہت اونچی ــــــ مگر صاحب رشید میں برائی ہی کیا ہے۔ بس غریب ہی تو ہے۔
زبیدہ : غریب امیر کا سوال نہیں۔ سوال اس کا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اگر میں رشید سے شادی کر لوں تو لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ سر ہدایت علی کی لڑکی آوارہ ہو گی، ایک کنگال کے ساتھ چل دی۔
محمود : اس میں آوارگی کیا ہے۔ جوانی میں سب ہی کرتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب معاف کیجئے گا جوانی میں کیا کم آوارہ ہوں گے۔

زبیدہ : خاموش رہیئے۔ بدتمیز۔ جاؤ یہاں سے ورنہ ——

محمود : یا وحشت۔ معاف کیجئے گا۔ میری زبان کمبخت گندی ہے۔ سنیئے تو —— بس ایک بات —— !

زبیدہ : آپ بیکار خود کو تھکا رہے ہیں۔

محمود : تو چلئے اس بنچ پر بیٹھ جائیں —— ذرا کے ذرا ——

زبیدہ : آپ چلے جائیے ورنہ میں سپاہی کو بلواتی ہوں۔

محمود : اوہ۔ خیر۔ ایک دفعہ ذرا پھر سوچ لیتیں۔

زبیدہ : سوچ لیا میں نے۔ آپ تشریف لے جائیے۔

محمود : لے جا تو رہا ہوں تشریف۔ ایک بات سُنئے۔ وہ ——

زبیدہ : کیا ؟۔

محمود : کہ اگر رشید کی جگہ میں ہوتا تو —— تو.....

زبیدہ : تو۔ ہنہ تو کیا کرتے آپ۔

محمود : میں ؟۔ بس کیا بتاؤں۔ دھری رہ جاتیں آپ کی ساری باتیں اور ہیں —— (چٹکی بجاتا ہے) بس۔

زبیدہ : (ہنس دیتی ہے)

محمود : اوہو ! شکریہ —— شکریہ !

زبیدہ : کیا شکریہ ؟۔

محمود : آپ کے تبسم فرمانے کا۔ شکریہ ہے کہ اب آپ غصہ نہیں۔ اب تو آپ اس غریب کا دکھڑا سن لیں گی ——

زبیدہ : میں ایک دفعہ آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے والد کا حکم نہیں ٹال سکتی۔

محمود : لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آپ کے والد صاحب ایسا چنگیزی حکم کیوں نازل کر رہے ہیں۔ ویسے تو بڑے قوم پرست بنتے ہیں۔ جب اپنی لڑکی کا سوال آتا ہے تو غریب کو ٹھکرا کر موٹے سے سیٹھ کی تاک میں ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ لالچی بڈھا ـــ

زبیدہ: کون لالچی بڈھا ـــ

محمود معاف کیجئے گا۔ آپ کے والد صاحب قبلہ ـــ زبان کمبخت!

زبیدہ: محمود صاحب! میں پھر آپ سے کہتی ہوں براہ کرم یہاں سے دفعان ہو جائیے۔ اور ـــ

محمود : سنئے تو ـــ

زبیدہ: میں کچھ نہیں سننا چاہتی ـــ (چل دیتی ہے)

محمود بس ایک بات ـــ اونہہ ـــ (سیٹی بجاتا چل دیتا ہے)

وقفہ

محمود : (واپس آکر رشید سے) لو بھئی ہم تو اپنی سی کر آئے۔

رشید: ذرا تیزی سے میں نہ کہتا تھا۔ وہ کبھی بھی اپنے خاندان کی ناک نہ کٹوائے گی۔

محمود : خاندان کی ناک ـــ سب مکاری ہے۔ ان خاندانوں کی ناک ہلکے سیز کچی ہے۔ یہ لڑکیاں خود جو کچھ نہیں کرنا چاہتیں خاندان اور سماج کے سر تھوپ دیتی ہیں۔ اس کا سارا الزام۔ اور خود مظلوم بنا جاتی ہیں۔

رشید: خیر اب تو تمہیں معلوم ہو گیا کہ زبیدہ ان لڑکیوں میں سے نہیں۔

محمود : محمود قطعی نہیں ـــ وہ بالکل بہانے کرتی ہے۔ تم تو ہو بزدل۔

رشید: اس میں بزدلی کیا ہے؟ کر کیا سکتا ہوں میں؟۔

محمود : یہ کر سکتے ہو جی ـــــ کہ ناک کاٹ لو چڑیل کی۔

رشید: محمود!

محمود : بکواس نہ کرو۔ ہتک کر رہے ہو تم مردوں کی۔ مردانگی کی اور مردوں کی طاقت کی۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو ـــــ

رشید: کیا کرتے ؟

محمود : وہ کرتا کہ زبیدہ بیگم سات پشتیں یاد کرتیں۔ سنو رشید تم تو اسے اب دیوی سمجھتے ہو نا۔ کیوں ؟

رشید: قطعی۔ اور کیا رہ گیا ہے میرے لیے دنیا میں۔

محمود : قطعی! تو پھر چلو ہٹاؤ۔ بس تم اسے پوجا کرو اور ہم اس سے شادی کرتے ہیں۔

رشید: معلوم ہے تمھیں کہ تم مجھ سے کچھ زیادہ امیر نہیں۔

محمود : امیر غریب کیا۔ میں تم سے کنگال ہوں۔ تمھارے چچا بیس روپئے مہینہ دیتے ہیں اور میں کالج کے خیرات خانے میں پلا ہوں۔ لو بس فیصلہ ہو گیا۔ سنو اس ہفتہ کے اندر اندر ہم شادی کر کے دیکھا دیں گے۔ سنا۔

رشید: (زور سے قہقہہ لگاتا ہے) ضرور۔

محمود : کیا گدھے کی طرح منھ پھاڑ رہے ہو ـــــ لو ـــــ شرط بد لو۔

رشید: (مذاق میں) خوب! بھئی ـــــ واہ اچھی شرط ہے۔

محمود : ہاں ہاں۔ لو۔ اس ہفتہ کے اندر لو۔ تم تو دیوی بنا کر پوجتے رہو۔ اور ہم لاتے ہیں اسے۔ رشید جانتے نہیں ہو مجھے۔ اگر کالج کے جھگڑے میں نہ پڑتا تو آج کو ـــــ

رشید: آج کو ہٹلر ہوتے ہندوستان کے۔

محمود : کچھ بھی۔ یہ ہتک ہے ہماری سمجھے۔ اب تم دیکھنا۔ کیا بتائیں۔ یار آج تو الہ آباد جانا ہے۔ اسٹوڈنس ایسوسی ایشن کی میٹنگ ہے۔

رشید: تو پھر چھوڑو اس میٹنگ کو۔

محمود : نہیں جی کرایہ مل گیا ہے۔ سکنڈ کلاس کا۔ جانا تو پڑے گا۔

رشید: اور پھر شادی ؟

شادی بھی ہو گی۔ تم ذرا اچکن وغیرہ دھلوا لو۔ شہ بالا تو تم کو ہی بننا پڑے گا (دونوں قہقہہ لگاتے ہیں)

اسٹیشن

[اسٹیشن پر خوانچہ والوں کی پکار۔ ریل کی گڑبڑ۔ دھکا پیل۔ زبیدہ نظر آتی ہے۔]

محمود : اوہو ــــ مس زبیدہ آپ بھی تشریف لے جارہی ہیں۔

زبیدہ: جی میں کلکتہ جارہی ہوں خالہ کے پاس اپنی۔

محمود : ہوں۔ رشید سے ڈر کر۔

(اخبار والے کی آواز)

زبیدہ: اخبار ــــ اے اخبار والے۔

محمود : ٹھیک۔ میں الہ آباد جارہا ہوں۔ آپ کو اگر کوئی تکلیف ہو تو ــــ

زبیدہ: (رکھائی سے) شکریہ۔ اخبار والے۔

[ریل چل دیتی ہے۔ دوسرے اسٹیشن پر وہ پھر اخبار والے کو پکارتی ہے۔ وہ نہیں سنتا تو نیچے اتر کر بک اسٹال پر جاتی ہے۔ ریل چل دیتی ہے اور وہ جلدی میں محمود کے ڈبہ میں گھس جاتی ہے۔]

محمود : ارے ــــ کون ہے جی ــــ

زبیدہ: میں ہوں۔ ریل چل دی اور جلدی میں ـــــ

محمود: ابھی جلدی ہے۔ اوہ ـــــ آپ ہیں مس زبیدہ۔ معاف کیجئے گا۔ میں سمجھا کوئی آوارہ عورت ہے۔ تاکہ ـــــ

زبیدہ: کیا؟۔

محمود: تاکہ موقع ملے اور مجھے پھنسا دے۔ اجی میں ان عورتوں سے بہت ڈرتا ہوں۔ اور خاص طور پر اکیلے ریل کے ڈبوں میں۔

زبیدہ: آپ عورتوں سے بھی ڈرتے ہیں؟

محمود: جی۔ صرف عورتوں سے ہی ڈرتا ہوں۔ مردوں کو تو ٹھوک کر درست کر لیتا ہوں مگر ـــــ

زبیدہ: آپ مجھ سے بھی ڈرتے ہیں ـــــ (اطمینان سے)

محمود: کہہ تو دیا سب عورتوں سے ڈرتا ہوں۔

زبیدہ: مگر میں بھلا آپ کا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔

محمود: بگاڑ تو آپ بھی خوب سکتی ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ میں آپ کو بگاڑ لینے دوں گا۔

زبیدہ: یہ کیسے؟

محمود: یہ ایسے کہ ابھی آپ غل مچا دیں کہ میں آپ کی عزت لے رہا ہوں تو۔

زبیدہ: محمود صاحب!

محمود: جی مجھے گھڑکیاں دینے کی کوشش نہ کیجئے۔ یہ پارک کا میدان تو ہے نہیں۔ نہ باباجی کا گھر۔ یہ میرا ڈبہ ہے سمجھیں۔

زبیدہ: آپ بالکل وحشی ہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔

محمود: جی میں وحشی سہی۔ بڑی آئیں وہاں سے تمیز سکھانے۔ اگر میں ابھی ابھی اٹھ کر آپ کو اپنا گرم گرم بچھونا دیتا اور خود بیٹھ کر آپ کی حسین صورت تکتا

تو آپ کہتیں میں بہت تمیز دار ہوں، معاف کیجئے گا ایسے الو کہیں اور بستے ہیں۔

زبیدہ: آپ یا تو بالکل پاگل ہیں — یا —

محمود: پاگل ہوں گی آپ — اگر آپ زبان سنبھال کر نہیں بیٹھ سکتیں تو تشریف لے جائیے —

زبیدہ: یہ آپ کا ڈبہ تو نہیں۔

محمود: جی۔ ہاں۔ اس وقت تو یہ ڈبہ میرا اور میرے باپ کا ہے۔ سنا۔ اگر آپ چیں چپڑ کریں گی تو کان پکڑ کے —

زبیدہ: میں — زنجیر کھینچ لوں گی۔ اگر آپ —

محمود: ذرا کھینچئے تو زنجیر۔ اٹھا کر ریل سے باہر پھینک دوں گا۔ رشید نہ باشد کہ الو بنا لیا۔

زبیدہ: آپ کو شرم نہیں آتی — عورتوں —

محمود: ہم کچھ عورتیں وورتیں نہیں جانتے۔ سمجھیں۔ اور ہمیں کچھ شرم نہیں آئے گی کون یہاں بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اٹھا کر پھینک دیں گے۔ اور پھر کہہ دیں گے جان کر کود پڑی۔ خودکشی کرنا چاہتی تھی۔

زبیدہ: آپ جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔ کون مانے گا آپ کی بات ہے۔

محمود: ہاں ہاں کیوں نہیں — سب مان لیں گے۔ جب میں انھیں بتاؤں گا کہ والد آپ کے عاشق سے شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔ اس لئے —

زبیدہ: عجیب انسان ہیں آپ۔

محمود: اور دوسرے۔ تم — تم —

زبیدہ: کیا ہے۔

محمود : یہی کہ تمھیں اکیلے سفر کرتے ڈر نہیں لگتا؟
زبیدہ: کیوں اس میں ڈر کی کیا بات ہے۔
محمود : لو کوئی ڈر کی بات نہیں۔ فرض کیجئے کوئی آپ کی عزت پر حملہ کرے۔
زبیدہ: ایں۔ایں — واہ —
محمود : ہاں — فرض کیجئے میں ہی — میں ہی ذرا —
زبیدہ: مجھ سے بات نہ کیجئے — آپ پاگل — (مڑ جاتی ہے)
محمود : اے جی دیکھو ہم کسی کی بدزبانی نہیں سہ سکتے۔ زبان کاٹ لیا کرتے ہیں۔ اور سنو۔ ادھر منھ کر کے بیٹھو۔ ہمارا دل گھبراتا ہے۔ دوسرے پیٹھ کر کے بیٹھنا بدتمیزی ہے۔
زبیدہ: مگر — مگر آپ ایسا مذاق —
محمود : مگر اور مچھلی ہم نہیں جانتے۔ اور نہ ہم تم سے مذاق کر رہے ہیں۔
زبیدہ: میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ جو آپ —
محمود : تم نے میرا بہت کچھ بگاڑا ہے۔ تم نے میری ذلت کی۔ رشید کی ذلت میری ذلت ہے۔ بلکہ سارے نوجوانوں کی ذلت ہے۔
زبیدہ: اسٹیشن آرہا ہے میں اتر جاؤں گی۔
محمود : نہیں — نہیں اتر سکو گی تم۔
زبیدہ: آپ مجھے زبردستی روکیں گے کیا؟
محمود : اور کیا؟ دیکھئے گا
زبیدہ : (ذرا اترنے کی کوشش کر کے) آپ روک سکتے ہیں۔ ہستی آپ کی —
محمود : ہستی تو میری بڑی بھاری ہے۔ پکڑ لوں گا۔ یوں — (اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔)

زبیدہ: چھوڑیے — چھوڑیے مجھے — چھوڑ —

محمود : اچھا۔ اچھا — لو۔ مگر دیکھو اترنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔ سمجھیں۔ سب کے سامنے پکڑ کر۔ ہاں لوگ پوچھیں گے تو کہہ دوں گا میری بیوی ہے۔

زبیدہ: محمود صاحب!

محمود : بیوی ہے اور روٹھ گئی ہے ذرا (ہنستا ہے) جناب کیا سمجھیں۔ اب تم اسٹیشن پر انھیں کہاں ثبوت دیتی پھروگی کہ میری بیوی نہیں۔ سر ہدایت علی کی بیٹی ہو۔ ہاں اور سارے اخباروں میں چھپ جائے گا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اور پھر وہ الیکشن — وہ اسمبلی میں سیٹ سب خالی رہ جائے گی — اور بھئی میں تو ایک کنگال طالب علم ہوں۔ کہہ دوں گا بیوی نہیں معشوقہ سہی۔ میرے ساتھ بھاگ کر جا رہی ہے بیچاری، ارے آپ کو سردی لگ رہی ہے۔ یہ لیجیے کمبل!۔

زبیدہ: ہٹ جائیے ہو چکا مذاق۔

محمود : کون کمبخت مذاق کر رہا ہے۔ لو۔ ہماری قسم کمبل اوڑھ لو۔

زبیدہ: جھوٹے۔ مکار۔ زمانہ بھر کے۔

محمود : اور — (ہنستا ہے)

زبیدہ: بدمعاش —

محمود : اہاہا۔ کیا پھول جھڑ رہے ہیں منہ سے۔ اور کہیئے۔ اور کچھ فرمائیے۔ دیکھئے ریل ہرک رہی ہے۔ کہیئے تو آپ کو غسل خانہ میں بند کر دوں۔ اور ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ ورنہ آپ —

زبیدہ: آپ حیوان ہیں بالکل۔

محمود : ہاں ضرور ہوں گا۔ لو بابا کمبل تو اوڑھ لو۔ سردی لگ گئی تو کہاں علاج کراتا پھروں گا۔ غریب آدمی۔

زبیدہ: ہٹ جاؤ مردود کہیں کے۔

محمود : اوہو۔ اب بھی اکڑ باقی ہے۔ دیکھو جی میں مذاق نہیں کرتا۔ پھر کہتا ہوں کمبل اوڑھ لو۔ ورنہ ـــــ (قہقہہ)

زبیدہ: آپ کو کیا ملے گا مجھے پریشان کر کے۔

محمود : تمھیں پریشان کر کے؟ ـــــ تم سمجھتی ہو میں تمھیں پریشان کر رہا ہوں؟ ـــــ سنو میں موقع کی تاک میں تھا۔ اور بھئی کمال ہے کہ موقع خود شاید میری تاک میں تھا۔ واہ رے اللہ میاں۔ واہ۔

زبیدہ: کیا بک رہے ہیں آپ؟

محمود : میں یہ بک رہا ہوں کہ میں جناب سے شادی کر رہا ہوں۔ کرنے والا ہوں۔

زبیدہ: کیا واہیات ہے۔

محمود : مذاق نہیں جب تم رشید سے شادی نہیں کرتیں، تو میں ـــــ میں موجود ہوں۔

زبیدہ: خاموش، بیہودہ۔

محمود : دیکھو کئی دفعہ کہہ چکا ہوں بدزبانی نہ کرو۔ ہاتھ اٹھ جائے گا تو پھر ـــــ ہاں دیکھو میں نے اس وقت ارادہ کر لیا تھا کہ تم سے شادی کروں گا۔

زبیدہ: زبردستی۔

محمود : قطعی! مگر اس کی شاید ضرورت نہ پڑے گی۔

زبیدہ: مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ (ہنستی ہے)

محمود : یہ ایسے ہوگا کہ کل اخباروں میں چھپ جائے گا کہ سر ہدایت علی کی صاحبزادی صاحبہ کی شادی خانہ آبادی مسٹر محمود متعلم ایم۔ ایس۔ سی سے انجام پا گئی آپ کو معلوم نہیں۔ میں آج ہی پریس کو لکھوں گا اور کل سارے اخباروں میں آپ کے والد صاحب پڑھیں گے۔

زبیدہ: آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ——

محمود : کہ مقدمہ چل جائے گا۔ تو کیا ہوگا۔ دو پیسہ کا آدمی ہوں۔ قید، سزا جو ہوگی بھگت لوں گا۔ مگر آپ اپنی کہیئے۔ وہ آپ کے والد کا نام اچھلے گا —— اور میرا کیا ہے۔ میرا کیا کوئی بگاڑے گا۔ دو کوڑی کا آدمی —— (قہقہہ)

زبیدہ: مگر یہ آپ میری زندگی کیوں برباد کرنا چاہتے ہیں؟

محمود : میری مرضی۔

زبیدہ: یہ اچھی ضد رہی آپ کی!

محمود : ہاں میری ضد ہی جو ہوئی۔ دوسرے صرف ضد کا سوال نہیں۔ میں نے رشید سے بڑ ہانکی ہے کہ تم سے ایک ہفتہ کے اندر شادی کر کے دکھا دوں گا۔ تیسرے ——

زبیدہ: کیا تیسرے؟

محمود : تیسرے یہ —— کہ —— زبیدہ مجھے تم کچھ پسند بھی آنے لگی ہو اور جو چیز مجھے پسند آتی ہے میں اسے ضرور حاصل کرتا ہوں۔

زبیدہ: مگر آپ سمجھتے ہیں اس زبردستی کی شادی سے آپ خوش رہ سکیں گے؟

محمود : اوہ —— بہت خوش —— چور چوری کر کے مزے سے چیز استعمال میں لاتا ہے۔ اور وہ مسرت ہوتی ہے کہ کہنا نہیں۔ سنا نہیں تم نے چوری کا گڑ میٹھا —— لو اسٹیشن آرہا ہے۔ دیکھو اگر اپنے والد کا نام بدنام کرنا نہیں

چاہتیں تو چپکے سے کمبل اوڑھ لو۔ اور ذرا آرام کر لو۔ یہ تو طے ہو گیا کہ تم میرے ساتھ الہ آباد جا رہی ہو۔ وہاں سے میں تمھارے والد کو تار اور خط بھیج دوں گا اور کل اخبار میں ــــ

زبیدہ : یہ نہیں ہو سکتا۔ میں قطعی آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔

محمود : کیوں اپنا کھیل مذاق ہو۔ اسٹیشن پر ہاتھ پکڑ کر گھسیٹوں گا۔ خدا کی قسم تصویریں چھپ جائیں گی اور پھر جانتی ہو اپنے والد کو ــــ

زبیدہ : خدا کے لئے للٰہ ذرا سوچئے۔ یہ آپ کو ہوا کیا ہے۔

محمود : خاندان کی ناک کٹ جائے گی زبیدہ بی۔ اور میرا کچھ نہ بگڑے گا۔ جانتی ہو بیرسٹر صاحب کو، وہ جو تمھارے ابا جان کے خلاف کھڑے ہو رہے ہیں۔ بس وہ میری طرف سے مفت پیروی کریں گے۔ اخبار میں نکلے گا کہ ــ کہ اور پھر تم تو سمجھ دار ہو۔

زبیدہ : آج کل بھی ایسے موذی ہوتے ہیں ــــ خدا۔

محمود : موذیوں کی دنیا میں کبھی کمی نہیں ہوتی لو کمبل اوڑھ لو۔ میں بجلی بجھائے دیتا ہوں۔ اسٹیشن آ رہا ہے۔ زنجیر کی طرف سے دھیان ہٹا لو۔ میرے ہاتھ کافی مضبوط ہیں ــــ ان کی بانگی دیکھنا چاہتی ہو ــــ ہی ہی۔ ہڈی پسلی سرمہ ہو جائے گی۔ لو سیدھی بیٹھو، آنسوؤں سے میرے اوپر کوئی اثر نہ ہو گا۔ مجھے عورتوں کے آنسو بڑے پیارے لگتے ہیں۔ دیکھو۔ لو احتیاطاً میں تمھارے منہ پر ہاتھ رکھے لیتا ہوں۔ چیخ نہ دو۔

زبیدہ : ہٹائیے ہاتھ میں نہیں چیخوں گی۔

محمود : ہاں یہ بات ہے۔ اب ہوئیں تم ٹھیک۔ چائے پیو گی ؟

زبیدہ : نہیں۔

محمود : کافی ؟
زبیدہ : نہیں۔
محمود : سوڈا، لیمن، برف ؟
زبیدہ : نہیں۔
محمود : ارے باپ رے ــــ پھر کیا پیوگی ؟
زبیدہ : زہر!۔
محمود : چھی چھی ــــ اچھی لڑکیاں زہر پی کر خاندان کو بدنام نہیں کیا کرتیں۔ لو سگریٹ پی لو ــــ نہیں ــــ خیر ــــ

(زبیدہ کے والد اور والدہ)

جج صاحب : او ــــ آ ــــ یہ ــــ یہ ــــ دیکھتی ہو ــــ زبیدہ کی ماں۔ اخبار!
بیگم : کیا۔ اوئی موا انگریزی اخبار سنگاتے ہو۔ میں کیا جانوں۔ کیا ہے۔
جج صاحب : ہے کیا تمھارا اور میرا سر۔ زبیدہ۔ زبیدہ۔ اوہ۔
بیگم : اے کچھ کہو بھی ہوا کیا ــــ ؟
جج : ریل ــــ الہ آباد۔
بیگم : کیا ہوا الٰہی خیر۔ میری بچی۔ اے میرے مالک۔ اے کچھ بولو گے بھی۔ میں اپنا سر پھوڑ لوں گی۔ اللہ جانتا ہے۔
جج : بدنصیب ــــ یا اللہ۔
بیگم : کیا۔ اے کیا ریل لڑ گئی کیا ہوا۔ ہائے میری بچی۔ اللہ میرے۔ یا مولا۔
جج : نابکار لڑکی ــــ مردار۔
بیگم : (رو کر) اے میرے مالک! اے کچھ پھوٹو بھی منہ سے۔

جج : بھاگ گئی۔
بیگم : خاک۔ تمھارے منھ میں ــــ کون ؟۔
جج : وہی تمھاری صاحبزادی ــــ ایک ایم۔ اے کے ساتھ۔
بیگم : اوئی کچھ ہوش میں ہو ــــ وہ تو کلکتہ گئی ہے اپنی خالہ کے پاس۔
جج : خاک گئی ہے خالہ کے پاس۔ یہ لکھا ہے تمھارے سامنے۔ یہ کہ بھاگ گئی۔ اوہ بڑھاپے میں منھ کو کالک لگا گئی۔ ناہنجار۔ مرجاتی اس سے تو۔ اسی دن کو کہا تھا۔ خالہ، نانیوں کے پاس نہ بھیجو۔ سب آوارہ ہیں چڑیلیں۔
بیگم : آوارہ ہوں گی تمھاری اماں بہنیں۔ واہ۔ خوب چلے میرے میکہ والوں کو کہنے۔
جج : آگ لگے تمھارے میکہ کو، منع کیا کہ نہ بھیجو۔
بیگم : آگ لگے تمھارے گنوں کو، منع کیا کہ نہ کراؤ ایم۔ اے۔ بی۔ اے۔ مگر نہیں وہ تو لاڈلی کو ــــ اور جو منع کرنے کو کہتے ہو تو یہ کب کہا تھا کہ تم نے کہ بھاگ جائے گی۔ یہ کہا تھا کہ موسم خراب ہے۔ نمونیہ کا ڈر ہے۔
جج : نمونیہ ــــ کاش نمونیہ ہو جاتا۔ مرجاتی۔ پیدا ہی نہ ہوتی۔ اور میں سید صاحب کو زبان دے چکا ہوں۔
بیگم : ہائے میری بچی۔
جج : تمھاری بچی۔ تمھیں اپنی بچی کی پڑی ہے اور مجھے اپنی۔ الیکشن میں ۲۴ دن رہ گئے ہیں، سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ یا خدا۔
نیاز : آسکتا ہوں میں ؟۔
جج : ارے آجاؤ بھیا ــــ یہ ــــ اوہ ــــ اُخوہ۔

نیاز : غضب ہو گیا بھائی صاحب۔ یہ قصہ کیا ہے؟ میں نے تو آج اخبار بھی نہیں دیکھا۔ آپ کی بھاوج بولیں۔ لو مبارک ہو۔

بیگم : خاک پڑے مبارک باد دینے والوں پر۔ کسی کا گھر جلے اور کوئی ہولی کھیلے ــــ یہ خوب رہی۔

نیاز : معاف کیجیئے گا بھابی جان انھیں کیا معلوم اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی خبر نہ تھی کہ یوں ناک کٹا جائے گی۔ مجھے زبیدہ سے یہ امید نہ تھی۔ کیا قصہ ہے، گئی کیسے؟

بیگم : ارے کلکتہ خالہ کے ہاں جانے کی رٹ لگا رہی تھی۔ مجھے کیا معلوم، میں نے ہاں کر دی۔ اے لو وہ چل دی۔

نیاز : بھئی معاف کیجیئے گا بھابی جان آپ کے ـــ بھئی وہ لوگ ایسے ہی آزاد خیال ہیں۔ وہ تو ہمیشہ کہا کرتی ہیں۔ آپ کی بھاوج کہ ــــ

بیگم : جسے دیکھو میرے میکہ ہی کا رونا روتا آتا ہے۔ تمھاری سسرال والیاں کون سی جنتیں بی بیٹھی ہیں۔ خیر النسا نے حمید سے نکاح پڑھوالیا۔ بیٹے برابر لڑکا کریمہ جا ـــ

نیاز : معاف کیجیئے گا۔ مگر میری سسرال کی لڑکیاں کوئی بھاگی نہیں۔

بیگم : اور میرے یہاں دن رات بس لڑکیاں پڑی بھاگتی رہتی ہیں۔

جج : ارے بھئی تم لوگ تو لڑنے لگے۔ یہ دیکھو۔ یہ تو سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔

نیاز : جی بالکل بجا۔ اب میری پوزیشن بھی کچھ ویسی ہو گئی۔ آخر میرے بھی بیٹیاں ہیں۔ سرور کی منگنی ہو رہی ہے۔ کیا کہیں گے سننے والے۔

جج : اوہ۔ جی چاہتا ہے کچھ کھا کر سو رہوں۔ زبیدہ تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ (مڑتے ہیں)

اللہ پاک اسے جلد اس دنیا سے اٹھالے۔

نیاز : مگر بھائی صاحب اب کیا کیا جائے۔ یہ بیرسٹر صاحب تو اب آفت کر برپا کردیں گے۔ ہزاروں پر پانی پھر گیا۔ اور مجھے اب مہرو اور گلو کی فکر ہے۔ تھانیدار صاحب کا لڑکا ٹریننگ میں تھا۔

بیگم : ارے بھائی سب کو اپنی پڑی ہے اور یہ کوئی نہیں بتاتا کہ وہ ہے کہاں ؟

جج : ہوتی کہاں جہنم میں۔ الہ آباد میں ہے اس پاجی کے ساتھ۔ ٹھہر جاؤ بچہ ناک میں تیر نہ ڈال دیا تو سر ہدایت علی نام نہیں۔ کسی کالج میں پڑھتا ہے۔

نیاز : یہیں ـــــ کالج میں۔

جج : تو آج ہی لو ـــــ ٹھہر تو جاؤ۔ اور اس زبیدہ کو گولی نہ ماری تو بات نہیں۔

نیاز : گولی مارنے سے کیا ہوگا۔ مجھے تو مہرو گلو کا خیال ہے۔ ان کی شادی۔ اب کتنی مصیبت آگئی۔ زبیدہ نے میری زندگی ـــــ

بیگم : ارے بھیا برا نہ ماننا۔ ویسے بھی تمھاری مہرو گلو پر کون سے پریزاد ٹوٹے پڑتے ہیں۔

جج : بھئی اس عورت کی زبان ـــــ نیاز میاں تم ہی چپ رہو۔

نیاز : میں بھائی صاحب بالکل چپ ہوں۔ میری مہرو گلو کچھ بھی ہوں بھائی جان وہ بھاگ کر نہیں چلی گئیں۔ وہ شریف کی بیٹیاں ہیں۔

بیگم : اور میری زبیدہ کمینی کی جنی ہے۔

نیاز : کچھ بھی ہو۔ میرا اس میں کوئی دخل نہیں صاحب۔ مگر اتنا تو کہوں گا کہ : خاندان کی ناک گئی۔ اور بھائی صاحب الیکشن۔

جج : ہاں بھائی الیکشن ـــــ وہ بھی گیا سمجھو ـــــ اور مجھے وہ مل جائے مردار۔

(زبیدہ پریشان داخل ہوتی ہے)

کون ــــ ؟ زبیدہ آگئی ـــــ خاندان کے نام کو آگ لگا کر آگئی چڑیل تو۔

زبیدہ: ابا جان! ـــــ

بج: بس خاموش۔ آوارہ۔ بدمعاش کہیں کی۔ نکل دور ہو میری نظروں سے۔ نکل جا یہاں سے مردار۔

زبیدہ: ابا جان! ـــــ

بج: خاموش ـــــ بدمعاش لڑکی۔ مجھے باپ کہہ کر ذلیل نہ کر۔ ننگِ خاندان۔ نکل جا یہاں سے، دور ہو۔ دور ہو۔ (جوش سے اٹھتا ہے)

نیاز: بھائی صاحب ـــــ بھائی صاحب ـــــ قبلہ ذرا ـــــ

زبیدہ: چچا جان ـــــ میں ـــــ

نیاز: زبیدہ! میں تمہارا چچا نہیں ہوں معاف کرو، مجھے مہربانی سے چچا نہ کہو میں اس لائق نہیں۔

زبیدہ: مگر سنئے تو ـــــ

نیاز: مجھے کچھ سننے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارے والدین بیٹھے ہیں۔ تم انھیں اپنے جھگڑے سناؤ۔ مجھے تو تم سے صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ تم نے خاندان کے لئے اچھا نہ کیا۔ تمہاری معصوم بہنیں مہرو گلو تمہاری اس حرکت سے ـــــ

زبیدہ: میری حرکت! مگر سنئے تو ـــــ

بج: چپ رہ بدمعاش لڑکی ـــــ غارت ہو یہاں سے۔ نکل جا میرے گھر سے۔ نکل۔ ابھی غارت ہو۔

زبیدہ: نکل جاؤں گی ـــــ ابا ـــــ

بج: نکل۔ نکل۔ اور دفان ہو۔ (زور سے دھکا دیتا ہے۔ زبیدہ گر پڑتی ہے) میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ مجھے بدنام کر کے اب مجھے لکچر دینے آئی ہے۔ نکل یہاں سے۔

ابھی نکل۔

[زبیدہ رو کر کچھ کہنا چاہتی ہے مگر وہ پھر گر جاتی ہے تو خاموش ہو جاتی ہے ۔
زبیدہ کی ماں اس کے ساتھ جانا چاہتی ہے]

بیگم : زبیدہ ....
جج : جانے دو اسے۔ تم مت جاؤ۔
بیگم : (رونے لگتی ہے) میرے جلے نصیب ـــ (بیٹھ جاتی ہے)
نیاز : اب کیا ہوگا بھائی صاحب. لوگ
جج : میں مار ڈالوں گا اسے اور خود بھی خودکشی کر لوں گا۔
نیاز : مگر بھائی صاحب ذرا سوچئے دنیا کیا کہے گی۔
جج : میں مر جاؤں گا تو پھر کہنے دو دنیا کو جو چاہے۔
نیاز : مگر بھائی صاحب اور بھی تو ہیں ـــ آخر اور بھی لوگ ہیں جو اس بدنامی کے بعد تباہ ہو جائیں گے۔ جوان لڑکیوں کی شادیاں کیسے ہوں گی۔ بچے کیسے پلے جائیں گے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے۔
جج : تم ہی بتاؤ کیا کروں ؟
نیاز : یوں گھبرانے سے کام اور بگڑ جائے گا۔ اب تو شادی کر لی اس نے ـــ اور۔
جج : ہیں ! تو تمھارا مطلب ہے کہ میں اسے خوشی خوشی منظور کر کے گلے لگا لوں ؟
نیاز : اور چارہ ہی کیا ہے۔ بھائی صاحب۔ شادی ہو گئی تو اب کیا کیا جا سکتا ہے۔
جج : بالکل نہیں۔ بس۔ میں اس کے گولی مار دیتا ہوں۔ قصہ پاک ہو جائے گا۔
نیاز : قصہ پاک نہیں ہوگا۔ بلکہ اور بھی گندہ ہو جائے گا۔ بھائی صاحب ذرا سوچئے میری بچیوں کا کیا ہوگا ؟ عابدہ آپا کی بچیوں کا کیا ہوگا ؟ اقبال اور سعید کیا کریں گے۔

جج : ہوں ـــــ مگر آہ! موت بس موت ہی باقی رہ گئی میرے لئے تو ـــــ

نیاز : سنئے بھائی صاحب! اب شادی تو ہو گئی۔ مگر ابھی تک دنیا کو یہ پتہ نہیں کہ وہ بھاگ گئی تھی۔ یا آپ نے ہنسی خوشی شادی کی۔

جج : کیا مطلب ہے؟ تمھارے خیال میں اس کنگال سے دو کوڑی کے آدمی سے میں اپنی اکلوتی بیٹی بیاہ دوں؟

نیاز : بیاہ دینے کی بھی خوب رہی۔ اجی بیاہ تو ہو بھی گیا۔

جج : آ۔ ہاں۔ مگر ـــــ (ایک دم گھبرا کر) ہٹ جاؤ ـــــ بس اب مجھے اسے مار ڈالنے دو۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ (پھر جوش آجاتا ہے)

نیاز : جلدی نہ کیجئے ـــــ شادی تو ہو گئی۔ اب اگر آپ راضی خوشی ہو جائیں تو ـــــ

بیگم : ہوں۔ میری بچی کو کیا کوئی جڑتا نہ تھا جو وہ کنگال کو جائے۔ اے اس کے لئے تو ہزاروں ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ تم نہ اپنی مہر دو گلو کو دے دو ـــــ تب میں جانوں۔

نیاز : بھائی جان! میری لڑکیاں آوارہ ہو کر بھاگ جائیں تو میں بیشک۔

جج : میں کہتا ہوں اس قطامہ کو گولی مار دینے دو۔

نیاز : بے کار میں بھائی صاحب آپ تو بس ـــــ ذرا سوچئے کیسی تھڑی تھڑی ہو گی اور یوں لوگ کیا کہیں گے۔

جج : چولہے میں ڈالو لوگوں کو۔

نیاز : ویسے الٹا آپ کا نام روشن ہو گا۔

جج : وہ کیسے؟

نیاز : لوگ کہیں گے اتنے بڑے رئیس ہیں مگر دیکھو ایک معمولی لڑکے کو ہونہار

دیکھ کر لڑکی دے دی۔

جج : ہوں ـــــ مگر ـــــ

نیاز : اور تمام شہروں میں دھوم مچ جائے گی۔ آج ہی اخباروں میں نکلوا دوں گا کہ قوم کے حامی، فخرِ اسلام سر ہدایت علی کی فیاضی ـــــ

جج : واہیات ہے یہ سب، بھلا ایک کنگال کے ساتھ رہ ہی کیسے سکتی ہے زبیدہ، وہ اس قدر عیش و عشرت میں پلی ـــــ

نیاز : تو اچھا ہے۔ اس کو بھی اپنا کیا بھگتنے دیجئے۔ اس نے خود ہی اپنے پیر میں کلہاڑی ماری۔ کیا ہم نے اسے کنگال دے دیا ؟

جج : ہوں ـــــ (سوچتے ہیں)

نیاز : ہاں صاحب۔ ذرا اطمینان سے سوچئے ڈنکا بج جائے گا آپ کے نام کا۔ کتنی زبردست قربانی، کتنا بڑا ایثار، اکلوتی لڑکی کو غریب سے بیاہ دیا۔ کتنے دریا دل مشہور ہوں گے۔ آپ، الیکشن میں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ یہی باتیں تو کام آتی ہیں۔

جج : ہاں مگر کہتے تو ٹھیک ہو تم۔ بلاؤ زبیدہ کو ـــــ

نیاز : ہاں اب آپ یہ کیجئے کہ چپ چپاتے رخصت کر دیں۔ بہت کریں عمائدین شہر کو ایک ڈنر یا ایٹ ہوم دے دیں۔

بیگم : مگر لوگو غضب ہے کہ نہیں۔ نیاز میاں میں خوب تمھاری چالیں سمجھتی ہوں۔ اپنی حمد و گلو کی کر دیتے یوں جب میں جانتی بڑے قوم پرست ہو۔

جج : چپ رہو جی مت بکواس کرو۔ تو ہاں میاں نیاز تم کرو انتظام۔ اور وہ کیا کہا تھا تم نے اخباروں کا۔

نیاز : اخباروں کا ؟
جج : ہاں بھئی وہی کچھ چھپوانے کا ہمارے لئے۔ کچھ وہ قوم وغیرہ کا۔
نیاز : ہاں ہاں وہ تو آج ہی لیجئے۔ وہ آپ کی تصویر بھی ——
جج : ہاں وہ تمغہ والی۔ اور ہاں وہ ایٹ ہوم۔ کا بھی زبیدہ کو بلاؤ۔ ہم سمجھائیں اسے۔ اس لڑکے کو بھی بلاؤ۔ (زبیدہ آتی ہے) تم نے جو کچھ کیا ہم معاف کرتے ہیں۔
زبیدہ : مجھے آپ کی معافی کی ضرورت نہیں۔
نیاز : کیا کہتی ہو زبیدہ —— قدم پکڑ کر معافی مانگو۔
زبیدہ : خاموش رہیئے چچا جان۔ اوہ مجھے آپ کو چچا جان نہ کہنا چاہیئے۔ نیاز علی صاحب آپ دخل نہ دیں۔
نیاز : کیا نیاز علی ! زبیدہ ! تم —— پاگل ہو گئی ہو۔
جج : ہم کہتے ہیں ہم نے معاف کی تمہاری یہ حرکت۔ (ڈانٹ کر رعب سے)
زبیدہ : مجھے نہیں چاہئے آپ کی معافی۔
جج : سنو۔ بس چپ چاپ جاؤ اپنے کمرے میں۔ اور کہاں وہ ہے۔ وہ لڑکا نیاز ٹیلیفون کرو کالج۔ اور بلاؤ اسے۔
زبیدہ : میں اس گھر میں گھڑی بھر نہیں رہ سکتی۔ میں جا رہی ہوں اسی وقت۔
جج : شام کو ڈنر کے بعد تم آموں والی کوٹھی میں چلی جانا۔ جاؤ یہ تمہاری حرکت ٹھیک نہیں تھی۔ شادی کرنا تھی تو ——
زبیدہ : کس کی شادی۔ میری شادی نہیں ہوئی کسی سے۔
جج : ہیں —— کیا —— شادی نہیں ہوئی ؟
زبیدہ : جی ہاں۔ میں بھاگ آئی الہ آباد سے۔

جج : اے لو نیاز میاں ــــ یہ لو، ارے بھاگ آئی۔ یہ شادی کیسے نہیں ہوئی۔

زبیدہ : وہ دغاباز ہے محمود۔ اس نے زبردستی روکے رکھا الہ آباد میں۔ میں وہاں اپنی ایک سہیلی کے یہاں رہی۔ اور موقع ملتے ہی ــــ

جج : موقع ــــ ارے! نیاز میاں سنتے ہو ؟

نیاز : (نیاز آتے ہیں) جی ہاں بھائی صاحب۔ بھئی زبیدہ یہ کیا قصہ ہے ؟

زبیدہ : قصہ یہ ہے کہ یہ محمود بہت بدمعاش ہے۔ وہ مجھے زبردستی الہ آباد لے گیا۔ اور ــــ مگر میں نے شادی سے انکار کر دیا۔

جج : اور یہ اخبار ؟

زبیدہ : یہ سب جھوٹ ہے ــــ اس پر مقدمہ چل سکتا ہے۔

نیاز : لو! بھئی یہ خوب رہی ــــ تو شادی نہیں ہوئی۔

جج : ہو گئی اور شادی نہیں ہوئی۔

زبیدہ : جی نہیں۔ اس نے صرف مجھے ذلیل کرنے کے لئے اخبار میں چھپوا دیا۔ اور آپ ــــ آپ ــــ اوہ ــــ

جج : اب ؟ نیاز میاں ــــ ارے کمبخت تو ــــ یہ قصہ کیا ہے لو۔ مگر کمبخت تو بھاگ کیوں آئی ؟

زبیدہ : بھاگ نہ آتی تو کیا اس دغاباز کے ساتھ چلی جاتی ــــ میں آ گئی خاندان کی خاطر، آپ کا نام ذلت سے بچانے کے لئے۔

جج : آ ــ آ ــ بھئی ــ مگر ــ اب ــ

زبیدہ : اب ــــ اب یہ کہ جہاں میرا منہ اٹھے گا چلی جاؤں گی۔ میرا اس گھر میں ایک منٹ کے لئے بھی ٹھہرنے کا بھی حق نہیں۔ اوہ ــــ

جج : مگر نیاز میاں ــــ یہ ــــ ارے زبیدہ ــــ او ــــ اوہ ــــ

ارے لوگو ــــ مجھے بندوق لادو۔ میں اس منحوس لڑکی کا اور اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ افوہ میری عزت مٹی میں مل گئی ــــ اوہ ــــ

زبیدہ: بس چپ رہیے۔ میں سمجھتی تھی آپ لوگ میرے والدین ہیں، آپ کو میرے ساتھ ہمدردی ہوگی۔ مگر میں نے دیکھ لیا۔ میرا کوئی نہیں ــــ آہ ــــ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اوہ۔ (روتی ہے)

نیاز: بیٹی زبیدہ ــــ تم سمجھ دار ہو ماشاء اللہ۔ میں نے ٹیلیفون کیا ہے وہ آرہا ہے۔

زبیدہ: کچھ نہیں چچا جان! میں آپ لوگوں کو ایسا نہیں سمجھتی تھی ــــ میں کبھی یہ نہیں سمجھتی تھی کہ یوں میرے ماں باپ بغیر معلوم کئے مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیں گے۔ اور مجھے خوش خوش ایک آوارہ انسان کے سپرد کر دیں گے۔

جج: مگر بیٹی ــــ جانے دو جو کچھ ہوا ــــ دیکھو یہ بات اگر یہیں نہ ختم ہوئی تو بڑی بدنامی ہوگی۔ میں نے اسے ابھی بلایا ہے۔ سب بات طے ہو جائے گی۔

زبیدہ: پہلے جب آپ نے سنا کہ میں نے شادی کر لی تو آپ کی بدنامی ہونے لگی۔ جب چچا جان نے ایک چال سمجھا دی تو پھر اب شادی نہ کرنے میں بدنامی ہونے لگی۔ گویا میں صرف آپ کی بدنامی اور نیک نامی کے لئے ایک کھلونا ہوں۔ جب چاہا بنایا۔ جب چاہا توڑ دیا۔

نیاز: جانے دو زبیدہ چپ چپاتے شادی ہو جائے گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ دیکھو اسی میں مصلحت ہے۔

زبیدہ: اچھی مصلحت ہے آپ لوگوں کی! میں اس کمبخت سے کبھی کبھی شادی نہ

کروں گی۔ جس نے مجھے اتنا ذلیل کیا۔ اس بری طرح مجھے پریشان کیا۔
اوہ میں موت کو ترجیح دوں گی۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔

جج : تو نیاز میاں! پھر مقدمہ چلاؤ اس مردود پر ـــــ زبیدہ اوہ کاش تو
مرجاتی۔ یا میں مرجاتا ـــــ

نیاز : مقدمہ میں کیا رکھا ہے بھائی صاحب ـــــ اور اب مہرِ گلو کی منگنی
کا سوال بھی ختم ہوا۔

زبیدہ : میری بلا سے۔ میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔ اماں جان۔ ابا جان۔

بیگم : بیٹی۔ ہائے میرے مولا۔ میری بیٹی ـــــ

نیاز : زبیدہ میری بیٹی۔ میرے بڑھاپے کا خیال کرو۔ کچھ نہیں تو مہرِ گلو کا
خیال کرو۔ رحم کرو بیٹی۔

زبیدہ : رہنے دیجئے ـــــ (رقت سے) مجھے جانے دیجئے۔ ایک مطلبی ہیں آپ۔

نیاز : نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ تم اتنی بے رحم نہیں ہو۔ زبیدہ۔ لو میں
تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

جج : بیٹی ـــــ (بیٹھی آواز سے رونے لگتا ہے) بیٹی زبیدہ۔ بھول جاؤ بیٹی۔

زبیدہ : ابا جان ـــــ (خود بھی رونا ہوتا ہے)

نوکر : (آن کر اطلاع دیتا ہے) محمود میاں آئے ہیں سرکار۔

جج : نیاز میاں۔ لو وہ آگیا۔

نیاز : ہاں بھائی صاحب۔ آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔
میں اس سے بات کرتا ہوں۔

جج : اور ایٹ ہوم ـــــ دعوتی رقعے ؟

نیاز : سب ٹھیک ہو جائے گا۔

جج : اور وہ ـــــ کیا کہتے تھے اخباروں میں چھپوانے کا ہمارے لئے۔

نیاز : (دور جاتے ہوئے) جی ہاں وہ کبھی ـــــ وہ ـــــ